جذباتِ بھاشا

حضرت نیاز فتحپوری

ناظم صاحب دائرۃ الادب دہلی

نے

منشی نظام الدین منیجر کے اہتمام سے

جنٹس اسٹنڈرڈ الیکٹرک پریس دہلی میں طبع کرا کے شائع کی

بار اول (۱۰۰۰)　　　　قیمت مجلد ۶/۱

جس کتاب پر دائرۃ الادب کی مہر نہ ہو اسکو مسروقہ خیال فرمانا چاہیئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

ایک انسان کے لیئے، اِس سے زیادہ دلچسپ بات، اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے مذاق کے موافق گفتگو کرنیکے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے ،،

آپ مجھہ سے مرزا سلطان احمد کی اساس الاخلاق کی نسبت دریافت کیجئے۔ آپ میرے خط و خال دیکھنے کے بعد، میری خاموشی کی کوئی تاویل نہ کرسکینگے تو کم از کم یہ تو ضرور ہوگا کہ آپ دوبارہ یہ سوال کرنے کی ہمت اپنے میں نہ پائینگے۔ لیکن آپ مجھہ سے پوچھئے کہ یونانیوں کے علم الاصنام کے متعلق تیرا کیا خیال ہے۔ اور پھر اگر آپ کم از کم ایک نماز کا پورا وقت نہ ضائع کردیں تو میرا ذمہ۔ اسلیئے اگر آج مجکو یہ موقع ملتا ہے کہ میں جذباتِ بھاشا کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کروں، جو اُس زبان کی شاعری سے بحث کرتی ہے، جسکی خصوصیات کا میں آج سے نہیں بلکہ اِک مدت سے دلدادہ ہوں تو آپ سمجھہ سکتے ہیں کہ میرے لیئے یہ کیسی مسرت آمیز گفتگو ہے"۔

ادب اردو کی دنیا میں یہ بات ضرب المثل ہے کہ اُردو بوجہ اپنی کم سنی کے بہت ہی کم مایہ ہے اور ابھی وہ اِک مستقل زبان کہلائے جانے کی مستحق نہیں ہے یعنی ابھی اُس میں اسقدر سرمایہ جمع نہیں ہوا کہ اسکی بقائے حیات کا ضامن ہوسکے، بنابرآں اربابِ فکر و رائے ہمیشہ سے اِس بات کے ساعی رہے ہیں کہ اِس زبان میں کثرت سے تصانیف و تراجم کیے جائیں، غیر زبانوں کا مواد اِسس میں منتقل کیا جائے۔ اور اُنکے محاسن و نکات ادبی سے اُردو کا دامن حیات مالامال کردیا جائے تاکہ وہ ہر تخیل کو اُسی حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کرسکے، کہ جس حُسن و خوبی کے ساتھ ایک وسیع و لطیف زبان ادا کر سکتی ہے۔ اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مؤلف جذباتِ بھاشا کی یہ سعیِ جمیل دنیائے ادب میں ضرور مشکور ہوگی، اور اربابِ نظر، اُسکو اُسی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس کی وہ مستحق ہے "

حقیقت یہ ہے کہ اِس کتاب کے قابل مؤلف نے اک ایسی زبان کے لٹریچر کو ادب اُردو سے روشناس کرایا ہے۔ جس کی نسبت ملک عرصہ سے اپنے اندر اک خاص شوق پنہاں رکھتا ہے، اور گو زبان بھاشا کی شاعری کے متعلق اسوقت تک اُردو میں کوئی مستقل تصنیف شائع نہیں ہوئی، لیکن جرائد عصریہ میں وقتاً فوقتاً کچھہ کلام شائع ہُوا ہے، اور اِسکی نسبت اربابِ رائے نے اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ جس سے ملک مانوس ہوگیا ہے۔ اِس لیئے اگر میں یہ رائے قائم کروں کہ ملک میں اِس قسم کی تالیف کی ضرورت محسوس کیجارہی تھی تو شاید غلطی نہ کرونگا

بہر حال تالیف پیشیں نے ایک بڑی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اب اِس سعی کی قدر افزائی کرنا اور آیندہ اِس صنفِ ادب پر لائق مولف کو دیگر حصص کے شائع کرنے پر متوجہ کرنا ملک اور اہلِ ملک کا کام ہے +

اِسکے بعد میں بھاشا شاعری کی چند خصوصیات اور اُسکے مختص لطائف و محاسن پر اِک نگاہ ڈالنا چاہتا ہوں +

بھاشا کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت جو اِسکو اُردو اور فارسی سے ممتاز بنا دیتی ہے ، یہ ہے کہ اقتضائے فطرت انسانی کے مطابق اِس میں تخاطب مرد کا عورت سے ، اور عورت کا مرد سے ہوتا ہے (اُردو فارسی کی طرح نہیں کہ امرد پرستی کا بازار گرم ہے) یہی سبب ہے کہ شاعر کے دل میں جذباتِ محبت ، بالکل سچے اور صحیح پیدا ہوتے ہیں - کیونکہ پاکیزہ جذبات کا پیدا ہونا جب ہی ممکن ہے جبکہ اُن کے پیدا کرنے میں اقتضائے فطرت سے جنگ نہ کی جائے +

دوسری نہایت دلکش و دل آویز خصوصیت یہ ہے کہ عموماً تخاطب جنسِ لطیف کی طرف سے ہوتا ہے ، اور یہ ایسی خصوصیت ہے کہ اگر اِسکی اور تمام خوبیوں کو نظر انداز بھی کر دیا جائے - تب بھی دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری پر اسکو نمایاں امتیاز حاصل ہو جائے گا +

تیسری خصوصیت بھی اپنی نوعیت میں کچھ کم نہیں کہ خود زبانِ بھاشا ، بہت نرم واقع ہوئی ہے ، اور اِس لحاظ سے تغزل کے لیے ، جس کا حُسن ہی یہ ہے

کہ نرم و سادہ زبان استعمال کی جائے، بہت مناسب ہے۔

دوسری زبانوں میں تغزل کے لیئے تلاش اور جستجو سے الفاظ مہیا کیئے جاتے ہیں، لیکن بھاشا میں اِس دقت کا سامنا نہیں، کیونکہ وہ تو خود سراسر اک ترنم، اور سراپا اک لوچ ہے۔

دوسری زبانوں کے بلند خیال شعرا اکثر اِس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے کلام میں ایسی بات پیدا کریں جو کہیں نہو، خواہ وہ اِس سعی میں جذبات سے دُور ہی کیوں نہ جا پڑیں، چنانچہ وہ ایسی تشبیہوں اور استعاروں کے لانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جن کو حقیقت میں محسوسات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اور جو سریع الانتقال الی الذہن نہیں ہوتے۔ حالانکہ لطفِ کلام، اور فطرت انسانی، اس امر کی مقتضی ہے کہ تشبیہات و استعارات ایسے ہوں جنکو سُننے کے بعد ذہن انسانی فوراً مشبہ بہ کی طرف منتقل ہو جائے۔ بھاشا کی شاعری میں یہ بھی خوبی ہے کہ اِس میں زیادہ تر اُنہیں تشبیہات و استعارات سے کام لیا جاتا ہے جو ملک کے محسوسات اصلی ہیں۔

نہ اِس میں نظر سے اُوجھل آسمان کی پیداوار کا ذکر ہے۔ نہ اِس میں اُن مہمل تعلقات کا ذکر ہے جن سے فطرت مضطرب ہوتی ہے، بھاشا کا شاعر ایرانی شعرا کی طرح کشمیر کے محسوسات و پیداوار کا دیوانہ نہیں۔ اور نہ شعرائے عرب کی طرح ناقہ، و ناقہ، و ساربان کے پیچھے مارا مارا پھرنا وہ اپنا شعار خاص سمجھے، وہ

بلبل و قمری سے مطلب نہیں رکھتا، وہ تو کوئل و پپیہے سے کام رکھتا ہے،
جن کی صدائیں جذبات کو برانگیختہ کرنے میں ہندوستان والوں کے لیے وہی
رتبہ رکھتی ہیں جو ایرانیوں کے لیے بلبل کی نغمہ سرائیاں، پھر اردو شعرا کا محض
تقلیداً اک ایسی چیز کا ذکر کرنا جسکو انھوں نے کبھی دیکھا بھی نہیں، کیسی ناموزوں
بات ہے'۔

اگر وہ بلبل اور اسکی بہار کو چھوڑ کر کوئل و پپیہے سے کام لیں، اور کوشش
کرکے اس موسم سے لطف اٹھائیں جب کہ یہ دونوں بیتاب ہو ہو کر چیختے
ہیں۔ تو یقیناً انکے جذبات میں بہت زیادہ اثر پیدا ہو جاے گا۔

شاعری کی روح اسلوب بیان ہے، اور آپ دیکھیں گے کہ اس لحاظ سے
بھاشا کی زبان کیسی مالا مال ہے، بھاشا کا شاعر معمولی سی معمولی بات کو اس
رنگ سے بیان کرتا ہے کہ اس میں اک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت فوراً
متاثر ہونا چاہتی ہے، ہم یہاں کوئی انتخاب نہیں دیتے؛ کیونکہ یہ ساری تالیف
نہایت ہی منتخب اشعار پر مشتمل ہے، اور ارباب ذوق دیکھیں گے کہ وہ انداز
بیان کے متعلق بعض بعض دوہے کیسے دلچسپ پاتے ہیں۔

لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ دلچسپیاں بھاشا کی شاعری میں پیدا کیوں
ہوئیں؛ اور اس کا اصل راز کیا ہے، آپ اگر غور کرینگے تو معلوم ہو جائے گا
کہ ہر ملک کی شاعری حقیقتاً اس ملک کی تمدنی و معاشرتی زندگی کا آئینہ

ہوتی ہے، اور اسلیئے اس اصول کی بنا پر جب ہم اس مسئلہ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو اس زبان کی شاعری کے حسن پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، کیونکہ جس زبان میں ہندوستان کی عورت اپنے جذبات کا اظہار کرے گی۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا قیامت ہوگی؟ اول تو عورت کا عورت ہی ہونا۔ اسبات کے لیئے کافی ہے کہ وہ معمولی سے معمولی گفتگو سے اک عالم کو بے قرار و مضطر بنا دے، (اسمیں کسی زمین اور کسی حصہ ملک کی خصوصیت نہیں) اور پھر ہندوستان کی عورت جسکی فطرت میں غیر معمولی وفاشعاری ومحبت پرستی، ودیعت کی گئی ہے؛ اب سمجھ لیجئے کہ جب اُس کی طرف سے اظہار تعشق ہوگا تو کیا قیامت ہوگی۔؟

آپ تمام دنیا کے طبقۂ اُناث کو دیکھئے۔ مگر جو دل آویزیاں اس ملک کی عورت میں پایئے گا، اور کہیں نظر نہ آئیں گی؛ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عورت شوہر پرستی میں اپنا نظیر نہیں رکھتی؛ جسکا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے بعد اپنی زندگی کو بالکل بے کار سمجھکر اُسپر اپنی جان قربان کردیتی ہے! بہ ظاہر اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ملک کے تمدنی مراسم نے اُسکے کیرکٹر میں مضبوطی پیدا کرادی ہے۔ کیونکہ وہ اک شوہر کے بعد کسی صورت میں دوسرے خاوند کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لاسکتی، جسکا اثر یہ ہے کہ باوجود اُن تمام گلہ مندیوں کے جن کی پرورش اُسکے نازک دلمیں ہوتی رہتی ہے، وہ اپنے شوہر کو ہر حال میں اک نعمت غیر مترقبہ سمجھتی ہے، اور وہ اُس

وقت سے کانپتی رہتی ہے کہ اُس کا شوہر اُس سے جُدا ہو؛ کیونکہ ہندو عورت کا سوز بیوگی، اِک مستقل درد، اک مجسم کرب وبے چینی ہے۔ اور اُسکی یہ زندگی اِک ایسا فسانۂ سوز، اک ایسی داستان گداز ہے۔ جس کی نظیر دنیا کے کسی گوشہ میں نہیں مل سکتی؛

پھر ظاہر ہے کہ ایسی عورت جب اپنے دُکھ کی کہانی، اپنی بپتا، اپنے فطری نرم ونازک لب ولہجہ میں سُنائیگی تو کیا کچھ اثر نہ ہوگا —؛

ہماری آنکھیں نہیں اور نہ ہم دیکھیں کہ کائنات کا ذرہ، ذرہ بیتاب ہے ہمارے کان نہیں، ورنہ ہم سُنیں کہ ساری فضا رو رہی ہے؛

آہ، موسمِ برشگال میں جس کی رنگینیاں، و رعنائیاں، مردہ دلوں کو بھی بیتابِ نشاط کر دیتی ہیں، وہ فردِ صنفِ نازک، اتفاق سے اپنے شوہر سے جدا ہو جاتی ہے تو اودسے، اودسے، بادلوں کے ذریعہ اپنا پیامِ فراق اپنے محبوب تک پہنچانا چاہتی ہے؛ وہ تنہا سیاہ راتوں میں بجلی کی چمک، بادلوں کی گرج سے دہل جاتی ہے، کانپ اُٹھتی ہے، اور اُس کا فطرتی لوچ اُس وقت کسی سے لپٹ جانا چاہتا ہے —؟؟ مگر اپنا پہلو خالی دیکھکر تڑپنا چاہتی ہے کہ پپیہا اپنی ؟ پی کہاں ؟ کی آواز سے اور بے قرار کرکے اُڑ جاتا ہے؛ .... وہ انہیں جذبات وتاثرات کو بجنسہ الفاظ میں ادا کر دیتی ہے؛ اور یہی ہے وہ سب! جسکو ہم بھاشا کی شاعری کہتے ہیں؛

ہرچند اس زبان کی شاعری کرنے والے بھی مثل دیگر زبانوں کے زیادہ تر مرد ہی ہیں، اور ممکن ہے کہ اس بنا پر یہ شبہ ناشی ہو کہ وہ نسوانی جذبات کا اظہار پوری طرح نہ کر سکے ہونگے۔ لیکن جسوقت آپ اس تالیف کو بنظر غور ملاحظہ فرماویں گے تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس زبان کے شعراء نے بھی فطرت نسوانی کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اور کوئی رقیق سے رقیق جذبہ بھی عورت کے نازک سینہ میں پیدا ہونے والا ایسا نہیں جسکو انھوں نے الفاظ میں ضبط نہ کر لیا ہو۔ خودداری، وقار، حجاب و شرم، غرور حسن، فتادگی محبت، طعن و تشنیع، بولی ٹھولی، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ایسی بات نہیں جو اس زبان کے حیطۂ نظم سے باہر ہو،،

علاوہ اسکے ایک بات آپ اور بھی ملاحظہ کرینگے کہ اس زبان کی تشبیہات میں اک خاص قسم کی ندرت ہے۔ اور اس ندرت کے ساتھ اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ مشبہ بہ ایسا تلاش کیا جائے۔ جس میں ایک سے زیادہ وجہ شبہ موجود ہو، اور چونکہ تشبیہیں بالکل اُن چیزوں سے متعلق ہوتی ہیں جو ہمارے روزمرہ مشاہدہ میں آتی ہیں۔ اس لیئے اِن کا اثر عجیب و غریب ہوتا ہے پھر وقّت مضامین، تلاشِ معانی، ندرتِ ترکیب، علوئے خیال، کی بھی بعض بعض مثالیں نہایت لطیف و پاکیزہ موجود ہیں۔ غرضکہ اس زبان کی شاعری اکثر اعتبارات سے بہت مکمل و دلچسپ ہے،،

اب میں اصل تالیف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ ملک کے بہترین انشاپرداز ہمارے محترم دوست مولانا، **نیاز محمد خاں** صاحب **نیاز** فتحپوری، اک عرصہ سے اِس بات کے متمنی تھے کہ اِس زبان کی شاعری پر کچھ لکھا جائے، اور نہایت ہی پاکیزہ مثالیں تلاش کرکے جمع کی جائیں۔ حُسنِ اتفاق سے مولانا ممدوح کا کچھ دنوں ریاست اجے گڈھ سے توسل ہو گیا۔ اور وہاں اُن کو بھاشا زبان کا ایک عمدہ کتب خانہ مل گیا، کم و بیش وہ سال بھر تک وہاں رہے، اور اِس عرصہ میں اُنھوں نے وہاں بہت زیادہ، اور عمدہ مواد جمع کرلیا جس کی یہ صرف اک مختصر قسط ہے، اُن کا ارادہ ہے کہ اگر پبلک نے ضرورت سمجھی تو اپنی معلومات کا بقیہ حصہ بھی پیش کرینگے؛

قابل مؤلف نے ہر دُوہے کے بعد اُسکے مشکل الفاظ کے معانی، اور پھر حل لکھکر انشاپردازی کے نکات اور اُسکی خوبیاں اِس انداز سے بیان کی ہیں کہ اُس زبان کی تمام لذتیں اپنی زبان میں لے لی ہیں۔ علاوہ اِس کے شاعری کے محاسن اور کلام کے دیگر خصوصیات سے بحث کی ہے۔ جس نے بجائے خود اک نہایت دل چسپ و نادر مضمون کی شکل اختیار کرلی ہے؛

حضرت نیاز اپنی انشاپردازی و شاعرانہ مذاق کے لحاظ سے کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں۔ اُنھوں نے زبان اُردو میں جس جدید طرز انشا کی بنیاد ڈالی ہے، اور اُن کو جن لطائف و پاکیزہ جذبات سے مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے

اِس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ ملک نے جس جوش و خروش کے ساتھ اُنکی ادبی خدمات کا خیر مقدم کیا ہے وہ بھی میری نگاہ میں اعتراف کا ادنے طریقہ ہی مگر اِسکا کیا علاج کہ خالص ادبی مذاق کا ملک میں فقدان ہے۔ اگرچہ اب وہ اگلا سا جمود تو نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی خیالات میں وہ غُلو نہیں جو صحیح معنی میں ان مغتنم وجود ادیبوں کی قدر کر سکے ؎

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ملک اِس تالیف کے ساتھ کیسا سلوک کرے گا، لیکن قابل تشکر ہے سید **ظفر احسن** صاحب **علوی** ناظم دائرۃ الادب (دہلی) کی یہ سعی جمیل جو اُنکی طرف سے اِس قابلِ قدر تالیف کی اشاعت میں ظاہر کی جاتی ہے ؎

اگر پبلک نے پبلشر کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ اِس تالیف سے دل چسپی لے سکتے ہیں۔ اور ذوق ادبی ہندوستان سے ابھی بلکہ مفقود نہیں ہوا ہے! تو وہ زمانہ دور نہیں جب دائرہ کیطرف سے مسلسل ایسا پاک اور عمدہ لٹریچر پیش ہوتا رہے اور خصوصاً اِس تالیف کی بقیہ اقساط بھی پبلک میں رونما ہوں، اور پھر بھاشا شاعری کے متصوفانہ رنگ کا کلام بھی اِس انداز میں سامنے لایا جائے، جو میرے خیال میں اک نہایت ہی اہم اضافہ **ادب اُردو** میں ہوگا!

میں اِس تقریب کو ختم کرتا ہوں۔ اور ناظم صاحب **دائرۃ الادب** کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے مجھے اِس تالیف پر **تقریب** لکھنے کی

اجازت دے کر مجھے، اپنے **محبوب ترین** دوست مولانا **نیاز** کے ساتھ اس طرح دائمی **مواصلت** کا موقع دیا!

جو میرے لئے غیر معمولی مسرت کی بات ہے!

۱۰- جولائی ۱۹۱۵ء
دہلی

(ابو المعالی) **خلیقی** دہلوی

۷۸۶

دیباچہ
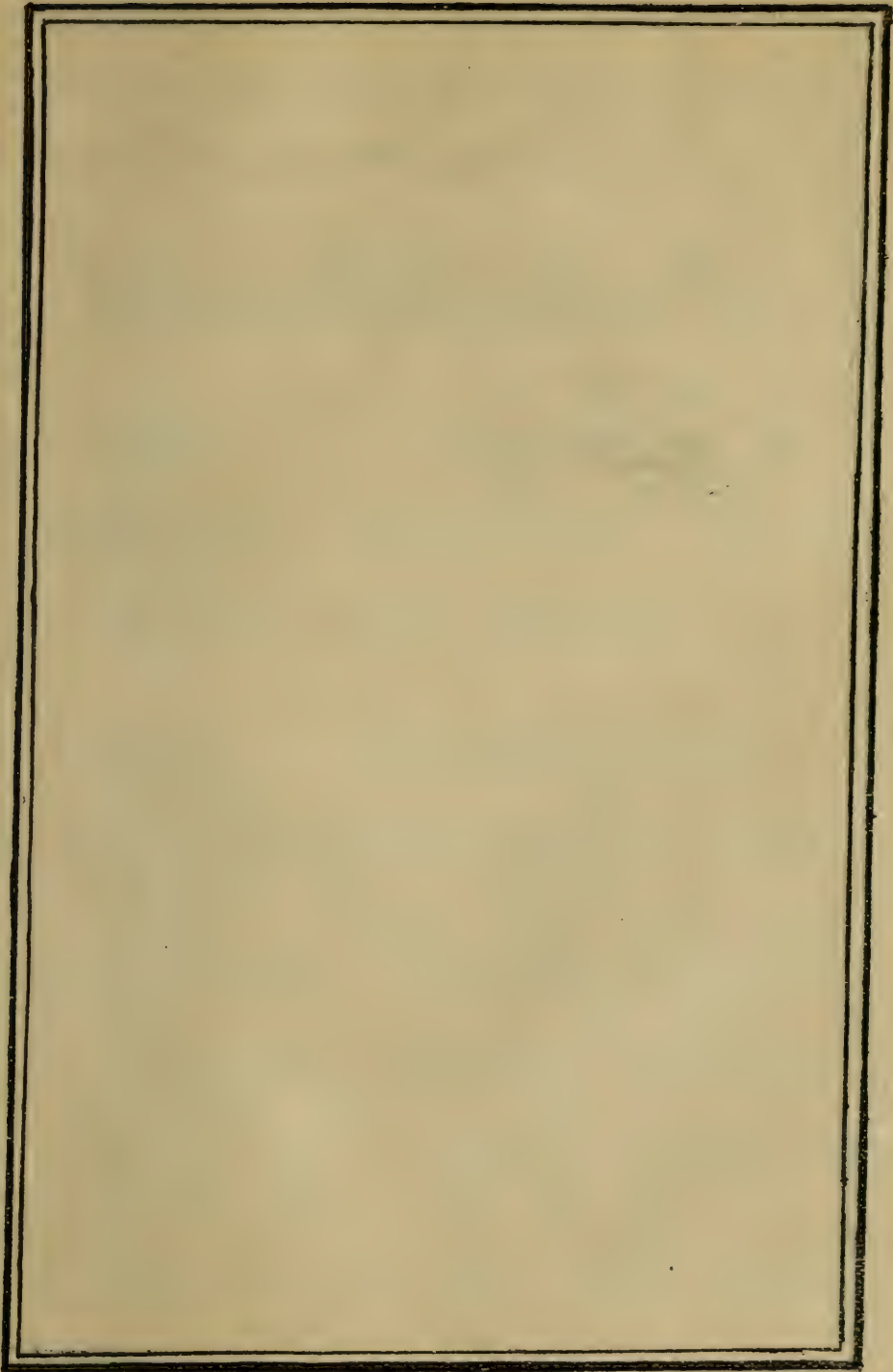
میرا مقصد یہ نہیں کہ میں کچھ ایسی بحث شروع کروں جیسی آجکل میرؔ و سوداؔ، یا امیرؔ و داغؔ کی تفریق مذاق کے لیئے رائج ہے، اور نہ یہ ارادہ ہے کہ صرف کسی کے نقائص ظاہر کرکے اور اُسکے محاسن چھپا کے "نقادِ فن" کہلاؤں، کیونکہ میری رائے میں وہ وقت، جو ایسی فضول اور دور از کار بحثوں میں ضائع ہوتا ہے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ اپنی زبان، اپنے مذاقِ سخن کے وسیع بنانے میں صرف کیا جائے۔

اُردو کا نشو و نما جس انداز پر ہوا، اُس کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ اور اسلیئے میرے خیال میں اِس زبان کی ترقی کی تو کوئی انتہا نہ ہونی چاہیئے۔ وہ گلدستہ، جو مختلف گلشنوں کے پھولوں سے مرتب کیا گیا، جس کی بہار مختلف چمنوں کی غارت جائز سے پیدا ہوئی، اُسی وقت تک خوشنما اور نکہت بیز رہیگا، جب تک اُسکے اصولِ ترتیب قائم ہیں۔ اور یہی کون وارتقا (Evolution) ہے اُردو زبان اور اُردو شاعری کا۔ تبادلہ خیالات، تداخلِ جذبات کو، اِک ذرا نگاہِ تعمق سے دیکھئے، تو معلوم ہوجائیگا کہ اِسکی حکمرانی سارے نظامِ کائنات پر ہے: موجودہ تمدن کی

صورتیں، ترقیوں کی بوالعجبیاں، ایجادات کی بوقلمونی مرہون ہیں وسعت معلومات کی، اور وسعتِ معلومات منت کش ہے تبادلۂ خیالات کی، اِک نوزائیدہ بچہ اگر گنگ دایہ کی گود میں پرورش پائے، اور اُسکو کسی کی گفتگو سُننے کا موقع نہ دیا جائے، تو بڑا ہوکے بھی وہ گونگا ہی رہے گا۔

آریہ لوگ اگر وسط ایشیا سے نقل وحرکت کرکے دوسری قوموں سے نہ ملتے اور عشرتی ضروریات، تحفظ قوم کے خیالات، نیچر کی اور دوسری مخلوق کو دیکھکر نہ پیدا ہوتے، تو آج یہ ترقیاں، جو نگاہ کو خیرہ کررہی ہیں، کہاں نصیب ہوتیں؟ صحیفہ قدرت کا یوں تو ہر ہر صفحہ، ایک ایک لفظ معلوماتِ سرمدی کا بے بہا خزینہ ہے، لیکن اُسکا وہ زرّیں صفحہ جس میں نوع انسان کا ذکر ہے اُس قدرتِ کاملہ کی تصنیف کا بہترین حصہ ہے اور اِس لئے آدمی اگر مناظر قدرت سے دلچسپی رکھتا ہے، تو سب سے بہتر یہ ہے کہ وہ خود اپنا ہی مطالعہ کرے ؎

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو وسمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا

پھر اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ فطرت کے مقصدِ اصلی کو دیکھیں، اور اسکے مصداق صحیح بنیں، تو ہمکو حواس مدرکہ سے زیادہ کام لینا چاہیئے، اور اپنی نوع میں افراد کا سبب پیدا کرنا چاہیئے۔ خلقت انسان کو ملاحظہ کیجئے، تو معلوم ہوجائے گا کہ ماحول سے مستفید ہونا ہی باعثِ نظام اعضا، وقیام ہستی ہے، وہ قطرہ جو مادۂ آکسیجن،

ہیڈروجن، نیٹروجن، کاربن، گندھک اور فاسفورس کا مرکب ہے، اور جو ایک نہایت باریک جھلی میں اپنے چھوٹے چھوٹے ذرات کو اکٹھا کیئے ہوئے ہے، حرکت انقباضی و انبساطی کا محل ہے جو اپنے ماحول سے صالح الغذا چیزوں کو لیکر غذا بناتا ہے، اور اسی طرح رفتہ رفتہ گوشت، استخوان، بال، کھال کی صورت پکڑ لیتا ہے اور حرکت نفسی کا باعث ہوکر جملہ ارادی اور اضطراری حرکات کو پیدا کرتا ہے۔ اگر اسمیں یہ قوت کاسبہ نہ ہوتی تو یہ ہمارا وجود کس طرح ہوتا۔ اس لیئے جن اصول سے ہم عدم میں وجود میں آئے، تعجب ہے کہ وجود میں آنیکے بعد ہم اپنے بقائے وجود پر لحاظ نہ کریں اور انکو ترک کردیں۔

جب تبادلۂ خیالات ذریعہ قرار پایا استدامت ترقی کا، اور صرف زبان واسطہ ٹھیرا انتقال جذبات و خیالات کا، تو کوئی صورت ارتقا کی باقی نہ رہی تاوقتیکہ ہم اپنی زبان کو وسیع نہ بنائیں، اب دوسری طرح دیکھیے کہ ایک ہی چیز خواہ وہ کتنی ہی عمدہ اور دلچسپ کیوں نہو جب حواس اسکے حس اور ادراک سے سیر ہوجاتے ہیں تو اسکی وقعت گھٹ جاتی ہے، اور (EXCITEMENT) (تحریک) کے لیئے ضرورت ہوتی ہے کسی جدید اضافہ کی اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت خود مجبور کرتی ہے توسیع ادراک و معلومات پر، اور اس لیئے اگر ہم اپنی زبان کو بھی کل سب ذرائع سمجھ کے دوسروں کے خیالات اور جذبات سے متمتع ہونا چاہیں تو کیا کوئی ننگ ہے!

اردو زبان پر اگر مورخانہ نظر ڈالی جائے، تو ظاہر ہوجائے گا کہ اپنی پیدایش کے

زمانہ سے لیکر اِس وقت تک سیکڑوں رنگ و صورت اختیار کرچکی ہے اور اِس کا
ہر نیا ملبوس بہ نسبت اول کے نفیس و شاندار رہا، لیکن اسکے بولنے والے یہ دعوے
نہیں کرسکتے کہ اُسکی ترقی اُن حضرات کی منت کش ہے. اگر کوئی ایسا دعوے کرے
تو غلط ہی. جو کچھ حُسن صورت اِس زبان کو نصیب ہوا وہ سب صدقہ ہی اہل سیف کا،
جنہوں نے اسکو اپنے دفاتر، اپنے فرامین، اپنے مکاتیب میں جگہ دی اور اگر
خوش قسمتی سے حکومت اِسکا ساتھ نہ دیتی، تو غالبًا ارتقا کے پہلے ہی زینہ میں
اِسوقت بھی اسکو پاتے. لیکن باوصف حکومت کی حمایت اور اعانت کے اِس
نے کوئی ترقی ایسی نہیں کی جس سے ہم اُردو کو ہر اعتبار سے مکمل و متمول کہہ سکیں
اور اسکی وجہ صاف ہے، کیونکہ جس حد تک اُنکو ضرورت تھی اُنہوں نے درست
کرلیا، انکو کیا غرض تھی کہ اجنبی ہوکے ہمہ تن اُسی کی طرف متوجہ ہوجاتے، یہ کام
تو ہمارا تھا کہ ہم اُسکو ہمہ گیر بناتے، لیکن ہماری کوشش تو اِسی سے عیاں ہے کہ
اُس میں شاعری بھی اگر کی تو اِسقدر محدود اور تنگ کہ اکثر و بیشتر وہی خیال نظم کیے
جنسے اہل سیف لطف اُٹھائیں اور فارسی سے اگر اخذ کیا بھی تو صرف اُسیقدر،
غزل کہی تو وہی تیر و تفنگ کا ذکر، وہی قتل و ذبح کے حالات، معشوق کی تصویر
کھینچی، تو معلوم ہوا کہ کوئی اچھا خاصہ سورما منوں ہتیاروں سے لدا ہوا کھڑا ہے،
غرضکہ کوئی دقیقہ جنس لطیف کی تحقیر میں اُٹھا نہ رکھا یہ شاعری کا حال ہی، جسکی
نسبت کہا جاتا ہے کہ اُردو نے بہت ترقی کی، اور فنون کا تو ذکر ہی کیا کہ اگر اُردو

میں ترجمہ کرنے بیٹھ جایئے، تو ایک ایک اصطلاح کے لیئے گھنٹوں وقت خراب کیجئے۔ اور پھر بھی اگر خود ہی جسارت ہو تو البتہ دو چار وضع کر لیجئے، ورنہ وہ بھی ممکن نہیں، یہ ہے اندرونی حال اُردو کا اور اُسکی وسعتِ بطون کا۔ مگر ہاں یہ حیثیت شاعری اسقدر ترقی ضرور اُردو نے کی، کہ مشاعروں کا وہ زور و شور جاتا رہا جو پہلے تھا۔ اللہ اکبر، کچھ دنوں قبل یہ مرض ایسا پھیل چلا تھا، جس سے پبلک کی اخلاقی حالت ([illegible]) نہایت خطرناک حالت میں تھی۔ اس کی انتہاءِ قبولیت بس اِس سے سمجھ لیجئے، کہ ایک دفعہ مجھے بندیلکھنڈ کے ایک مختصر سے گانوں میں، جہاں مسلمان زیادہ آباد تھے، ضرورتاً قیام کرنا پڑا۔ شام کو ایک صاحب، بزرگ صورت، دھوتی گھٹنوں سے اوپر باندھے ہوئے، دستار بغیر کسی نظام و اصول کے پلیٹے، نہایت گھبرائے ہوئے، میرے پاس سے گزرے۔ اُن کی بدحواسی سے مجھے گمان ہوا کہ شاید کوئی حادثہ پیش آگیا ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ بزم "مُسائرہ" میں شریک ہونے جا رہے ہیں۔
"مُسائرہ"! ہائیں "مُشاعرہ"!!

میری بڑھی ہوئی حیرت دیکھکر اُنکو بھی ٹھٹک کے دریافت کرنا پڑا کہ "صنبھا کیسا"؟ میں نے جواب دیا۔ "حضرت، معاف فرمایئے گا، میں نے کبھی "مسائرہ" دیکھا نہیں ہے، اگر آپ مہربانی کرکے مجھے بھی ساتھ لے چلیں، تو آپکے طفیل میں میں بھی دیکھ لونگا۔ "مُسائرہ" کیسا ہوتا ہے"۔ وہ بیچارے اِس قدر نیک تھے، کہ

اُنکو میرے کہنے کا یقین آگیا اور اک فخر آمیز تبسم کے ساتھ فرمانے لگے "ہم کو بھی ایک گزل (غزل) پڑھنا ہے"۔ ایک تو ایسے مقام میں مشاعرہ کا نام ہی میرا شوق بڑھانے کے لیئے کم نہ تھا، اسپر اور طرہ اِس رُکنِ مشاعرہ کی گفتگو اور زبان! میری بیتابی کی کوئی انتہا نہ رہی، اور رواں دواں اُنکے ساتھ ہو لیا۔ میں پہنچا تو پہلے میری مُعرّفی بزم مشاعرہ سے کرائی گئی اور پھر غزلخوانی شروع ہوئی، اُس گھنٹہ بھر کی صحبت میں، اگر خلاف تہذیب نہوتا، تو میں اسقدر ہنستا، کہ شاید عمر بھر کے قہقہے میرے صرف ہو جاتے، لیکن بہت ضبط کیئے بیٹھا رہا اور داد بھی دیتا رہا، صرف ایک "سائر" صاحب کے دو شعر مجھے یاد رہ گئے ہیں جو مجکو پسند آئے۔ یہ حضرت ذہین تھے، کاش تعلیم یافتہ بھی ہوتے ؎

جانے کتنوں کا رکت تو نے بہایا ہوگا   جب رچی ہوگی کہیں توری گلابی ساری

(رکت) خون، "رچی ہوگی" خوب ہی۔ یہ شعر سن کے غالب کا یہ شعر مجھے یاد آگیا ؎

سات دریا کے فراہم کیئے ہوں گے موتی ؛ تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

دوسرا شعر یہ تھا ؎

دیکھ بھی لے کبھو گھونگٹ کو اُلٹ کر اپنے   گھال بھی دے کہوں نیناں کی کٹاری پیاری

(گھال بھی دے) یعنی مار بھی دے۔ "کہوں" بمعنی "کہیں"۔

اِس سے زیادہ اَور مقبولیت کیا ہو سکتی ہے، کہ بند ملکھنڈ ایسے پسپا اور نا تراشیدہ مقام میں بھی حضرتِ "سائرہ" ڈٹے ہوئے تھے، لیکن اب یہ امر محسوس کر کے مجھے بہت

مسرت ہو کہ پبلک خود بخود متنفر ہو چلی ہے اور محافلِ مشاعرہ کی گرماگرمی سرد
ہو گئی، تمام گلدستے جو حشرات الارض کیطرح اپنا مسموم مذاق لیئے ہوئے
ملک کو تباہ کر رہے تھے اب افسردہ نظر آتے ہیں۔ شاعری اگر صرف تک بندی
اور چند الفاظ کے مجموعہ کا نام ہے، بلالحاظ اس امر کے، کہ فی المعنی وہ کس حیثیت
سے دیکھے جانیکے قابل ہے، تو میں غلطی پر ہوں۔ اگر ان شاعروں کا مخالف
ہوں! لیکن، اگر شاعری جذبات حقیقی، اور وجدانی حسیات سے متعلق ہے، تو ایسی
مجالس کا بند ہونا ہی بہتر تھا۔ زلف کو پریشان، رُخ کو حیران، دیکھتے دیکھتے اور
سُنتے سُنتے جی پک گیا، کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی کہ کوئی نئی بات پیدا کرتا، وہی فرسودہ
اور پامال تشبیہات، وہی مقتل کے مناظر، وہی معشوق کا تمام آلاتِ حرب سے
مسلح رہنا، بیچارے عاشق کا اُسی انداز سے دن رات میں سیکڑوں بار مرنا اور
جینا، وہی عارض پر خط کی بہار، کمر و دہن کا وہی اعدام، غرضکہ ایک ہی لکیر کے فقیر
بنے رہے اور انچ برابر آگے قدم نہ بڑھایا، آپ ہی انصاف فرمائیں کہ ایسی بزم
مشاعرہ، جس میں سوائے اس مزخرف ہاہا ہو ہو کے اور کچھ نہ ہو، کبھی پسندیدگی
کے قابل ہو سکتی ہے، میں نے ہر جگہ تمام مشاعروں میں الاماشاءاللہ، یہی
کیفیت دیکھی اور اخیر میں تھک کے شریک ہونے کی قسم کھالی، رنگ تغزل
جس قدر عام ہوا، اُسیقدر ذلیل بھی ہوا، ہر کہ ومہ نے طبع آزمائی کی، گلدستوں
نے شائع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ لوگوں نے اُسکو دیکھ کے اس صنفِ سخن کو

ترک ہی کر دیا، ورنہ یہ صنف اِس درجہ پاکیزہ تھی کہ شاید ہی کوئی دوسرا ذریعہ برانگیختگی
جذبات کے لیئے اِس سے بہتر ہو۔ میرؔ کے کلام کو دیکھئے، تاثرات اور وجدان
کی زندہ تصویر ہے اور اکثر دہلی کے اساتذہ کا یہی رنگ رہا، لیکن لکھنؤ والوں
نے سوائے شوکتِ الفاظ، توالیِ تشبیہات کے نفسِ مطلب اور مقصد
غزل سے غرض نہ رکھی۔ میری رائے میں کسی دوست سے باتیں کرنا (جو
اصل مفہوم غزل کا ہے) اِس بات کو چاہتا ہی نہیں کہ تصنع سے کام لیا جائے
جسقدر اثر سادہ طور سے اصل حال کے ظاہر کرنے سے ہوتا ہے، اُتنا بناوٹ
سے ممکن نہیں، ایک مہجور اپنے حبیب سے ملکے صدماتِ مفارقت کو اِس طرح ظاہر کرتا
ہے کہ "تمہاری زلفوں کے خیال میں رات کالی ناگن ہو گئی، تمہارے ذراتِ
افشاں کے تصور میں اختر شماری کرتا رہا، دودِ آہ سے تمام آسمان پر کالے بادل
چھا گئے"، دوسرا اپنی تکلیف کو صرف اِن الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ "آپ کی جدائی
نے تو مجکو بہت بیقرار رکھا" کوئی سمجھدار آدمی نہیں کہہ سکتا کہ عاشق اول کو ذرا
بھی تکلیف رہی ہو، اور غیر ممکن ہے کہ دوسرے کے انداز بیان کا اثر قلب پر نہو۔
ایک اپنے ضعف و لاغری کا بیان اِس طرح کرتا ہے کہ "اب تو مبتلائے غم ایسا زار
ہو گیا ہے کہ عجب نہیں اگر چڑیاں اُسکو تنکا سمجھ کے اپنے گھونسلے میں اُٹھا کے لے
جائیں"۔ دوسرا صرف اِسی قدر کہتا ہے کہ "اب تو بیمارِ محبت کو اُٹھنا بیٹھنا بھی دشوار
ہو گیا ہے"۔ ایک کہتا ہے۔ "آپ کیوں اپنے تبسم سے جراحتِ دل پر نمک افشانی

کرتے ہیں "۔ دوسرا کہتا ہے۔" آپ کیوں ہنس ہنس کے اور بھی رُلا رہے ہیں"! اب آپ ہی انصاف کریں، کہ کونسا طرزِ بیان قلب میں اثر چھوڑ جاتا ہی۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ تشبیہات، استعارات، مبالغہ وغیرہ لغو اور بے کار ہیں، نہیں بلکہ مرادیہ ہے کہ جو بات کہئے موقع سے کہئے، "ہر سخن وقتے و ہر نقطہ مکانے دارد" کا لحاظ رکھیئے۔ کرتو رہے ہیں اپنے مصائب و تکالیف کا بیان، لیکن اللہ رے حضرت عاشق کا بانکپن، کہ وفورِ یاس میں بھی ضلع جگت سے نہیں چوکتے۔ صنائع لفظی کے لیئے قصائد پڑے ہوئے ہیں، اُن میں زورِ طبیعت دکھلائیے، غزل میں تو صرف کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی تشبیہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں، جیسے گانے میں مختصر سے کَن اور ہلکی ہلکی مُرکیاں۔ اور پھر علاوہ اس کے اگر بغیر تشبیہات کے زندگی محال ہے، تو کوئی نئی بات پیدا کیجئے، اندازِ بیان میں کوئی جدت دکھایئے، شاعری کا اسلوب بدلیئے، اور یہ ممکن نہیں تاوقتیکہ آپ غیر زبانوں کا مطالعہ نہ کریں اور اس امر کی کوشش نہ کریں، کہ جو بات اچھی معلوم ہو، اُردو میں محفوظ کر لی جائے۔

یہ امر قابل مسرت ہی کہ پبلک نے اپنی اس کمی کو محسوس کرنا شروع کیا ہے اور غزلیات کے معیار مروجہ میں بھی بہت کچھ رود بدل ہو گیا ہے۔ اخلاقی، تمدنی، قومی اور فطری نظموں کی طرف عام رجحان پایا جاتا ہے۔ جسکو دیکھکر کہا جا سکتا ہی کہ اگر اس مذاقِ صحیح کی جانب سے حسیات گمراہ نہ ہوئے، تو اُردو زبان بھی باعتبار

شاعری صفِ اولین میں شمار کی جاوے گی، تمام میگزین اور رسالے اب حصۂ نظم میں اسی نوع کی نظمیں شائع کر رہے ہیں، غزلیں اول تو بہت کم اور جو ہوتی بھی ہیں، تو مذاق صحیح اُن سے مترشح ہوتا ہی. موجودہ شعرائے لکھنؤ بھی اب اِس میں کافی حصہ لے رہے ہیں، لیکن مضمون زیر بحث پر آنیکے لیے، مجھ کو اِس امر پر ضرور غور کرنا ہے کہ آخر اکبارگی یہ طبیعتیں کیسے بدل گئیں؟ اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے، کہ ممالک یورپ میں جملہ فنون کے ساتھ زبان کو ہوئی بہت ترقی - اور ہمکو بلحاظ معاشرت اُس سے پڑا واسطہ، اپنے رنگ سے اُن کا انداز بہ حیثیت جذبات و تخیلات معلوم ہوا بھلا، بس فوراً اسی طرف رجوع ہو گئے، لیکن رفتار موجودہ اِس درجہ سُست ہی کہ شاید ایک صدی بھی ناکافی ثابت ہو ضرورت اِس امر کی ہے کہ جس قدر ممکن ہو، نہایت حریص اور طامع بن کے غیر زبانوں سے مسالہ اکٹھا کیا جائے، اور اپنی زبان کی تعمیر میں صرف کیا جائے. معلوم نہیں کتنے اصناف سخن اب تک ایسے باقی ہیں، جن کی ہوا بھی اُردو کو نہیں لگی ہی، لیکن اُن کے سراج پانیکے لیئے ابھی بہت ضرورت اِس امر کی ہے کہ پہلے تفحصانہ قدم اٹھایا جائے، اُسکے بعد اک اندازِ خاص کے ساتھ اُسکی مُعرّفی اردو سے کرائی جائے. میرے اِس خیال کی وقعت یوں نہیں معلوم ہو سکتی، کسی زبان کا آپ مطالعہ کریں، اُسمیں سر کھپائیں، تب پتہ چلیگا کہ ابھی وسعتِ زبان کے لیئے بہت گنجایش ہی اور ہنوز اُردو بہت ناممکل ہے، اِک ترکی ہی زبان کو لے لیجئے، اِس میں

کہتا ہوں ، کہ جس قدر نزاکت معنوی ، اور ندرت بیان سے یہ مالا مال ہے شاید ہی کوئی دوسری زبان ہو ، ایک دفعہ سید سجاد حیدر صاحب بی اے نے مجکو اپنے ایک ترکی دوست کی تصویر دکھلائی ، اکثر تصاویر پر کوئی نہ کوئی شعر لکھدیا جاتا ہے ، چنانچہ اُسکے ایک گوشہ میں بھی ترکی زبان کا ایک شعر درج تھا ، جسکا مفہوم شاید یہ ہے کہ " اس ہدیہ صورت سے یہ مراد نہیں کہ تو اسکو دیکھے اور مجھے یاد کرے ، کیونکہ اپنی مقدار ہستی کو دیکھتے ہوئے یہ خیال میرے لیے حجاب ہے ، مگر ہاں ، غرض صرف اتنی ہے کہ میری پرشوق ، کشادہ ، آنکھیں تجھے دیکھا کریں "

" ابھی ابھی صبح ہوئی ہے ، آفتاب نکل رہا ہے اور نسیم چل رہی ہے " ، اس منظر کی تصویر کھینچتے ہوئے ایک ترکی شاعر ہوا کے چلنے کو یوں ظاہر کرتا ہے کہ " گویا دن جاگ کر جمائیاں لے رہا ہے " کسقدر جدت ہے ، ملاحظہ ہو ۔

میں نے ایک دفعہ **صلائے عام** میں ایک مضمون بطور تمہید ہندی شاعری پر شائع کرایا تھا ، اور چاہتا تھا کہ اس زبان کے ماہرین اسپر لکھیں لیکن کسی صاحب نے توجہ نہیں کی ، مگر وہ خلش دل میں باقی تھی اور وقت کا منتظر تھا کہ خود تلاش و جستجو کر سکوں ، چنانچہ یہ مجموعۂ اوراق اُس میرے شوق کی قسط اول ہے ،

اس میں کلام نہیں کہ بھاشا کی شاعری جذبات اور اثرات سے مالا مال ہے ، اور جسقدر ترنم اور موسیقی اس زبان میں ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں ۔

اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جیسا عاشق اس زبان کی شاعری کو ملا، وہ کسی اور زبان کو نصیب نہیں ہوا، کیونکہ جنس قوی کے ہلاک کرنیکے لیئے اس سے زیادہ سریع الاثر کوئی چیز نہیں، کہ جنس لطیف کی طرف سے اظہار تعشق ہو۔ مگر اس سے یہ سمجھہ لینا کہ بالکلیہ اسی قسم کی شاعری بھاشا کی ہے غلط ہے۔ کیونکہ اکثر شعرا نے اپنی ساری تصنیف میں صرف عورت ہی کو سراہا ہے، اور سر سے لیکر پیر تک، کوئی عضو نہیں چھوڑا جسکی تعریف میں قلم فرسائی نہ کی ہو۔ خاصکر آنکھ، اور سینہ کے متعلق تو بعض بعض اشعار میں نہایت ندرت سے کام لیا ہے، مگر اصل رنگ وہی ہے جس سے بھاشا کی شاعری کیف انگیز کہی جا سکتی ہے۔

جس طرح اردو میں شاعروں کی بھرمار ہے، اُس سے کچھ کم بھاشا میں بھی ہے لیکن مستند اور مشہور صرف چند ہیں۔ تلسی داس، سور داس، کالیداس کو ہر شخص جانتا ہے، اور واقعی امر یہ ہے کہ یہ لوگ جذبات الوہیت کے اظہار میں بے مثل گزرے ہیں۔ اِنکے کلام پر جداگانہ بحث کرونگا، جو اس تالیف کی دوسری قسط ہوگی۔ اس میں تو صرف عاشقانہ رنگ کے لحاظ سے بحث کرنا ہے۔ اور دیکھنا ہے کہ بہ لحاظ انداز بیان، تشبیہات و استعارات، خیالات و جذبات، یہ زبان کسقدر عمیق ہے۔

یوں تو اس رنگ میں سیکڑوں نے طبع آزمائیاں کی ہیں، لیکن جو رتبہ ہندوؤں میں بہاری لال، اور مسلمانوں میں عبدالرحیم خانخاناں کا ہے، دوسرے کو

نصیب نہیں ہوا۔ گو ان کے علاوہ، پدماکر، سندر، رسلین وغیرہ بھی اچھے کہنے والے ہیں، مگر وہ بات کہاں؟

بہاری لال قوم کے برہمن اور متھرا کے رہنے والے تھے۔ سمت ۱۶۲۰ بکرمی ان کا زمانہ اختتام ہے، جسکو ۳۶۰ سال کا زمانہ ہوا۔ انکی تصنیف صرف ایک کتاب بہاری ستسئی سات سو اشعار کی ہے، جس کے صلے میں مہاراج جے پور نے انکو سات سو اشرفیاں دی تھیں۔ اسمیں شک نہیں کہ کتاب مذکور تشبیہات و استعارات، علو جذبات، معاملہ بندی، مضمون آفرینی اور حسن بندش کے لحاظ سے جواب نہیں رکھتی۔ بعض جگہ مضامین کی وہ آمد ہے کہ بے اختیار مرزا نوشہ غالب یاد آجاتے ہیں، اور کہیں سہل ممتنع کا وہ عالم ہے کہ حضرت میر کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ بعض اشعار اس درجہ دقیق اور صنعت ایہام کی ایسی پاکیزہ مثالیں ہیں، جنکے چار چار مفہوم جداگانہ پیدا ہوتے ہیں۔ ان اوراق میں زیادہ تر انہیں کا کلام پایئے گا۔

عبد الرحیم خانخاناں سمت ۱۶۱۰ بکرمی میں پیدا ہوئے، بیرم خاں کے لڑکے اور اکبری نورتن کے ایک رتن تھے۔ انہوں نے بھاشا زبان میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس زبان کے مستند شعرا میں انکو جگہ دی گئی۔ ان کا کلام ایسا مقبول ہوا کہ اکثر دوہے ان کے بطور ضرب الامثال عوام میں مشہور ہوگئے۔ تلاش سے کوئی مستقل کتاب انکی تصنیف سے دستیاب نہیں ہوئی۔ مختلف دوہے

شائقین کے پاس اِن کا گرنتھ دیکھا جاتا ہے۔ اِن کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کا اِن کو خاص مذاق حاصل تھا۔ اِن کا کلام بھی ملاحظہ فرمائیے گا۔ رحیم اور رحمٰن تخلص ہے۔

اب میں مختلف دُوہے درج کرتا ہوں جس سے اِس زبان کے اندازِ شاعری پر کافی روشنی پڑے گی، لیکن قبل اِس سے کہ میں اُن کو لکھوں دو باتیں بتا دینا ضروری ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ ہر دُوہے میں اِس امر کا معلوم کرنا کہ کس کی طرف سے ہے۔ یعنی نایک (عاشق یا شوہر) اِس کا کہنے والا ہے، یا نایکہ (معشوقہ یا بیوی) یا سکھی۔ اور مخاطب کون ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی عورت کا بیان ہے تو وہ کس قسم کی ہے۔ ہندی میں پہلے عورت کی قسمیں کردی ہیں، پھر اُن اقسام پر شاعری کی ہے۔ یہ تقسیم محدود نہیں ہے اور اِس لیے ایک اعتبار سے نامکمل کہی جاسکتی ہے۔ درمیان میں کہیں کہیں اُسکی طرف اشارہ ہوگا جس سے میرا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

واوین (" ") کے درمیان جسقدر عبارت ہوگی وہ نفس دُوہے سے متعلق ہوگی۔ اور اُس میں بھی قوسین ( ) کے اندر کا مضمون بغرض تصریح و تشریح ہے، اگر اُس کو جدا کرکے پڑھیے گا، تو قریب قریب دُوہے کا لفظی ترجمہ ہو جائے گا۔ چونکہ بھاشا شاعری میں روابط کا خیال نہیں کیا جاتا، اِس لیئے یہ ایک گونہ اہمال کہا جاسکتا ہے، اور تقدیم و تاخیر الفاظ کی بھی پرواہ نہیں

کرتے، اس لیے حسن ترکیب بھی قریب قریب مفقود سمجھنا چاہیے، مگر ہمکو اس سے غرض نہیں، یہ شعرائے بھاشا کا کام ہے، کہ اس نقص اور کمی کو پورا کریں، ہمکو صرف خیالات اور مضامین کی جستجو ہے، اور یہ دیکھنا ہے، کہ انداز بیان اس زبان کا کس قدر وسیع، اور جذبات کس حد تک عمیق و مؤثر ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین دلچسپی کے ساتھ ملاحظہ کی تکلیف گوارا فرماوینگے، اور جو نقص یا غلطی میرے سمجھنے میں رہ گئی ہوگی یا جس دوہے کا مطلب بیان کرنے سے میں قاصر رہا ہونگا، اُسکے متعلق اس فن کے ماہرین، ذریعۂ اخبار و رسائل، یا خطوط ذیل کے پتہ سے مجکو مطلع فرماوینگے۔ اس قسم کی تنقیدی تحریریں شکریہ کے ساتھ قبول کی جائیں گی۔ اخیر میں یہ بھی استدعا ہے کہ اگر اس نوع کا اضافہ زبانِ اردو میں اُنکے نزدیک و قیع ہے، تو مؤلف کو یہ باور کرادیں تاکہ وہ اس سلسلہ کو آیندہ بھی جاری رکھ سکے۔

سودائے تازۂ بہ سر زلف کردہ ایم
آگہ مگر نئیم ز سود و زیاں ہنوز

خاکسار
نیاز محمد خاں نیاز

فتحپور
۹- مارچ ۱۹۱۳ء
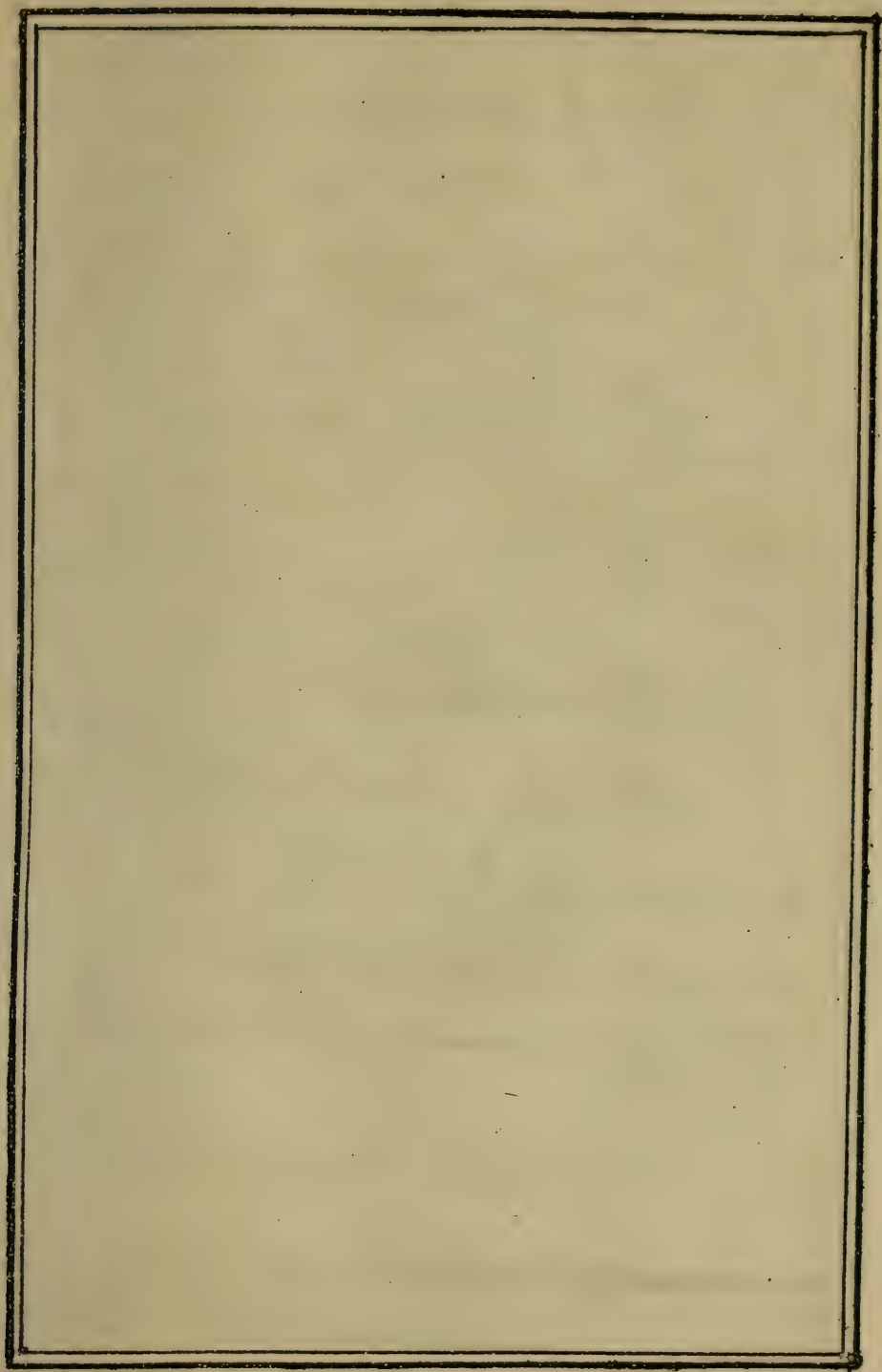
ایک نازنین جسکا شوہر پردیس میں ہے، بناؤ، سنگار کرکے کوٹھے پر چاند دیکھنے چڑھی، تو اُسکی ہمسن لڑکیوں نے چھیڑنا شروع کیا، کہ یہ پھبن کس کے لیئے ہے؟ وہ جواب دیتی ہے کہ:-

آج چندرماں دُوج ہے جگ چِتوَت چھُنل اَور
ہمرے اَور وا پیئر کے نین بھیئے اِک ٹھور

"آج ہلال نکلنے والا ہے، اور اِک زمانہ اُسکو دیکھتا ہے (کیا عجب ہی کہ) میری اور اُس (پیارے) کی نگاہیں اِسیطرح آپس میں ملجائیں" دردِ مہاجرت میں یہ وفورِ شوق کسدرجہ جرأت کا پہلو لیئے ہوئے ہے۔

ارے پپیہا باورے آدھی رین مت کُوک
دھیرے دھیرے سُلگتی، تو کاہے دینی پھُوک

جس طرح اردو فارسی میں بُلبل کے ترانوں سے موسم بہار میں کسبِ جذبات کیا جاتا ہے، اسی طرح بھاشا میں پپیہا کی آواز سے موسم برشگال میں تاثر پیدا کرنیکی کوشش کی جاتی ہے۔ اِس دُوہے میں بھی بیانِ فراق ہے۔ نائکہ اِسکی کہنے والی اور بیوگنی ہے۔ "او بادلے پپیہا! کیوں تو آدھی رات کو اپنے شور آواز سے مجھے بیچین کر رہا ہے۔ میں تو یونہی آتشِ مفارقت میں پڑی سُلگ رہی تھی تو نے اور "پی کہاں" کی آواز سے کسی کی یاد کو تازہ کر کے میرے زخمِ دل آلے کر دیئے اور (اک بارگی) لے کے پھونک دیا۔" اِس دوہے میں پپیہا کے ساتھ "باوَرے" کا لفظ بہت معنی خیز ہے اور "آدھی رین" کی تخصیص اک مہجور بلا کے لیے کرنے بیتابی ظاہر کرنیکے لیئے نہایت خوب ہے۔ سُلگنے کا مفہوم بھی ایسی حالت کے لیئے کسدرجہ وسیع ہے۔

سَجَن سَکارے جائینگے اَور نَیَن مَرینگے رُوئے
بِدھنا ایسی کیجیو کہ بھور کبھو نا ہُوئے

دُوہا بہت صاف ہے۔ "صبح کو میرے پی جانے والے ہیں اور اس لیئے جو حالت میری آنکھوں کی (کثرتِ اشکباری سے) ہونے والی ہے ظاہر ہے۔ سو بار خدایا (اِس رات کو اِسقدر طویل کر دے کہ) صبح ہی نہو۔" ہائے کیا سادگی تمنا ہے۔ اِس "کبھو نا ہوئے" سے جس قدر محبت ٹپک رہی ہے اُس کے اظہار کے لیئے ایک دفتر بھی ناکافی ہے۔

برسنت مینہہ اچھیہ اتی ابن رہی جل پور
پتھک تمہو تو گریہ تے اٹھت بھبھوری دھور

شوہر کے موجود نہ ہونے سے موسم برشگال، جس میں عاشقانہ جذبات کی کوئی انتہا نہیں رہتی، نہایت بے لطف گزر رہا ہے۔ اتفاق سے ایک پتھک (راہگیر) اُس طرف کا جانے والا جو ملگیا ہے تو اُس سے کہہ رہی ہے کہ "او میاں مسافر، برسات کا حال تو تم دیکھ رہے ہو کہ کثرت بارش سے تمام دنیا جل تھل ہو رہی ہے، لیکن (اگر وہ ملیں تو تم) اُن سے کہہ دینا کہ اِس بھری برسات میں بھی تمہارے گھر کے دروازے پر تو خاک ہی اُڑ رہی ہے۔" برسات میں دروازے پر خاک کا اُڑنا نہ صرف حُسن بیان ہے بلکہ بے کیف اور دردمند حالت کی مکمل تصویر ہے۔

کر کانپت، پتیاں لکھت جل بھر آوت نین
کورو کاگج ہاتھ دے مکھ ہی کہنا بین

"خط لکھتی ہوں تو ہاتھ (الگ) کانپتے ہیں، آنسو (جدا) نکلے پڑتے ہیں، (اے قاصد لے یہ) سادہ کاغذ ہی ہاتھ میں دیدینا، اور میرا حال اور میری بے چینیوں کا حال) زبانی ہی کہدینا" اسمیں بڑی نزاکت یہ ہے کہ ہاتھ کانپنے اور آنسو نکلنے کا حال پیغام میں شامل نہیں ہے بلکہ صرف قاصد سے اپنی حالت ظاہر کی ہے۔ پیغام کی صورت میں

تو صرف سادہ کاغذ روانہ کیا جاتا ہے، جسکو دیکھ کے لامحالہ سوال پیدا ہوگا، کہ یہ کیسا خط؟ پھر اُسپر قاصد آپ کہیگا جو حالت دیکھ آیا ہے یا سُن آیا ہو، میں نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ مؤثر طریقہ دردِ جدائی کے اظہار کا اور کیا ہو سکتا ہو دل محبت سے لبریز ہے لیکن دُکھا ہوا، مقصودِ الفت حاصل مگر دُور، خط لکھنے کا خیال ہوا تو سارے جذبات ہیجان میں آگئے، ہاتھ کانپ اُٹھا، آنسو جاری ہوگئے، سادہ کاغذ ہی بھیجدیا، مگر اسقدر نقوشِ محبت اُس میں پنہاں تھے؟ کسے خبر ہے۔

جَلِّج بَھِیُو، کیہر بھیُو، سُوانْ بھیُو پھر آئے
اَبْ اُباہْ بِیاہَتْ بھیُو، برہا بُری بلائے

جَلِّج = جونک؛ کیہر = شیر؛ سُوان = سگ؛ اُباہ = چرخ۔ مطلب یہ ہو کہ "دردِ محبت بھی عجیب بلا ہے، پہلے تو میرے حق میں جونک ہوا (کہ سارا خون پی لیا)، پھر شیر بن گیا (کہ سب گوشت اُسکے نذر ہوگیا) اسکے بعد سوان کا سا کام کیا (کہ مغزِ استخوان تک باقی نہ رہا) اور اب میں دیکھتی ہوں کہ، چرخ ہونے والا ہے (اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بھی قائم رہنے والا نہیں)" یہ اندازِ بیان مخصوص ہو بھاشا کے لیے؛ اردو فارسی میں میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ محبت کے مدارج اثر بیان کرنے کے لیے ایک دلچسپ انداز ضرور ہے، گو نازک نہو۔

یُوں دَل مَلیَت نِرُدَہیٔ دَہیٔ کُسُم سِی گَات
کَرُدھَر دیکھو دھَر دھَرا جھُون اُرُ کُو جَات

پہلی مواصلت کے بعد نائکہ (عروس) کی جو حالت اُسکی ہمراہ سکھی (سہیلی) نے دیکھی ہے، اُسکا گلہ نایک (شوہر) سے کر رہی ہے کہ "اے سنگدل، کُسم ایسے سریر کو (پھول ایسے نازک جسم کو) کوئی یوں بے رحمی اور بے دردی کے ساتھ ملتا دلتا ہے؟ ذرا اُس کے سینہ پر ہاتھ تو رکھ کے دیکھ (کہ کلیجہ کی کیا حالت ہو رہی ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ) اڑا جا رہا ہے"۔ کامرانیہائے وصل میں یہ شکوہ اور یہ اندازِ گلہ جسقدر پرمزہ ہے، اُسیقدر معاملہ بندی کی نہایت پاکیزہ مثال اور حالتِ خاص کی بڑی کیف انگیز تصویر ہے۔ اِس سے زیادہ نزاکت یہ ہے کہ یہ شکایت خود اُس گلِ مجروح کی جانب سے نہیں کی گئی ہے، کیونکہ اول تو اُسے اِسقدر ہوش کہاں، دوسرے نئی دولھن کی شرم و حیا اتنی بے تکلفی کب برتنے دیتی ہے؟ بلکہ اُسکی ہمدم سہیلی اُس نِردَیٔ سے شکوہ کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ دوہا معیارِ تہذیب سے گرا ہوا ہے۔ لیکن خوبیٔ بیان نے مجبور کر دیا۔

جو بھاوِے سو کر لَلا اِنھیں باندھ یا چھوڑ
ہَیں تو ہی سُو بَرَن رُوپ کے اِسے مِرے دِرِگ چور

"(اسمیں کلام نہیں کہ) یہ میری آنکھیں، تیرے حسن طلائی (سوبرن روپ) کی چور ہیں۔ (اب تجھے اختیار ہے) اُن کو سزا دے یا معاف کردے" اس موقع پر حضرت جلیل کا ایک شعر یاد آگیا، خوب کہا ہے ؎

اب اسکو پردہ دری سمجھو یا کچھ اور کہو　　تمہارے حسن کا چرچا ضرور میں نے کیا۔

مال مالتی کی گھول سون جہی چھپ رہیت
ہیر و من ہو نسے رہے ہر انہ پہنیوں سیت

مالتی کہتے ہیں چمیلی کو، اور سون جہی ایک قسم کی جوہی ہوتی ہے سنہرے رنگ کی۔ کہتی ہے کہ "(جب میں) چمیلی کا ہار پہنتی ہوں، سنہری جوہی کی سی بہار دیتا ہے، (کمبخت) یہ آرزو کبھی نہ پوری ہوئی، کہ سفید رنگ کا ہار پہن کے بیٹھتی" یہ اُس کے سنہرے رنگ کا انعکاس ہے کہ سفید ہار بھی طلائی معلوم ہوتا ہے، نہایت دل آویز انداز بیان ہے۔ اس قسم کی شاعری کو ہندی میں روپ گربتا (غرور حسن) کہتے ہیں۔

مکتا وا کے کان میں کہہ کارن ملیائے
ترچھی چتون سے ڈرے کہ پھر نا بیدھا جائے

مکتا = موتی۔ شاعر کہتا ہے کہ "اُس کے (آویزہ) گوش میں، موتی کیوں ہل رہا

ہے؟" دوسرے مصرعہ میں خود ہی پھر جواب دیتا ہے کہ" (اُس کے کانپنے اور لرزنے کی وجہ یہ ہے کہ) ترچھی نگاہ، بانکی چتون سے، پھر نہ کھیں (اسکا سینہ) مشبک کیا جائے"۔ حُسنِ بیان اور جدّت طرازی کی مثال ہے۔

اِیکُ تُو نَینَاں مَدُھ بھَرے دُوُجے اَنجَن سَار
اَرِے بَاوَرِے کَیُوں دِیت ہے مَتوَارَن ہَتھیَار

"ایک تو (یوں ہی تیری) آنکھیں نشیلی تھیں، دوسرے اُس پر (اور طرّہ) تحریر سُرمہ ارے دیوانے (یہ کیا قیامت کی) کوئی متوالوں اور بدمستوں کے ہاتھ میں بھی، ہتیار دیدیتا ہے"۔ ہائے، یہ مست انکھڑیاں یونہی کیا کم سفاک تھیں، جو تیغِ نگاہ پر اور سرمہ کی باڑھ رکھی گئی۔ نہایت پاکیزہ دوہا ہے۔ خیال کرنیسے کیف پیدا ہوتا ہے۔

بھُوشَن بھَار سَنبھَار ہے کیوں آ تَن سُکمَار
سُودِھے پَانوں نَا پَرَت سُوبھَا ہی کے بھَار

بھوشن۔ زیور کہتا ہے کہ" وہ تنِ نازک زیور کا بوجھ کیونکر اُٹھا سکتا ہے" (کیونکہ یونہی بغیر زیور کے) بارِ حُسن سے اُسکے پانوں تو سیدھے پڑتے نہیں، (چہ جائیکہ اُس بار پر اور اضافہ) " حُسن کو بار قرار دینا اور اُسکو بہکی ہوئی چال کا سبب

قرار دینا، بہت نزاکت کا پہلو لیے ہوئے ہے ؎

ہر جنبشِ نگاہِ خود اک حجاب ہے عارض پہ اُنکے جلوۂ ہستی نقاب ہے

ممالکِ یورپ میں شاید جنس لطیف کا زیور وغیرہ استعمال نہ کرنا اِسی بنا پر ہے !!

ہَرِی کَنچُلی کَس مَسی مَسکی رَہی کے ہِیر
جیسے بَکَست کَلی گُلاب کی نِکَسَت لِلَت لکیر

"سبز محرم (جو اُسکے سینہ پر) تنگ چُست (بھی تھا) جوش جوانی سے مسک گیا ہے" ہائے اُسکے لیئے کیا پیاری تشبیہہ تلاش کی ہے، کہتا ہے کہ "بس یہ معلوم ہوتا ہے، جیسے گلاب کی (برگ پوش) کلی شگفتہ ہو رہی ہو اور (اُسکے پتوں کے درمیان سے) سرخ لکیر نظر آتی ہو" اگر آپنے کبھی گلاب کی کلی کو شگفتہ ہوتے دیکھا ہے۔ اور اُس سرخ دھاری کو دیکھا ہے، جو پتیوں کے جدا ہوتے وقت پہلے نظر آتی ہے، تو شاعر کی تلاش کی داد دیجئے۔ گو اِس دوہے کا مضمون مہذب نہیں ہے، لیکن اِس نادر تشبیہہ کے لحاظ سے انتخاب میں آجانا اک امر ناگزیر تھا۔ ایسا ہی ایک دوہا عبدالرحیم خانخاناں کا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

رَحمن انگیا نیل کی رَت میں پھٹی رِتیک
مَنو کَسوٹی ہیم پر، دَہی ہیم کی لیک

نیلگوں سینہ بند (جو) ماتا پانی میں رکھیں، خفیف سا مسک گیا ہے
تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے سونے کی کسوٹی پر، سونے کی لکیر ہو۔"
سوٹی نیلگوں رنگ کی ہوتی ہے اور ذرا سی لکیر کھینچ کے اُسپر سونے کا
رنگ دیکھتے ہیں۔ تشبیہ بھی نہایت خوب ہے، اِس خفیف سے مسک جانے
کے لئے، کسوٹی تلاش کر کے اُسپر سونا کس کے دیکھنا، جس میں ہمیشہ ذرا
سی لکیر کھینچی جاتی ہے، شاعر کے کمال اور قوت بیان کی دلیل ہے۔

پنچ نہ لکھیت پہیرت کنچن سے تن بال
کمھلانے ہی جانے پرت اُر چمپے کی مال

پنچ = مطلق؛ بال - بکر؛ اُر = سینہ۔ ایک دوشیزہ کے رنگ کی تعریف
ہے کہ "(جب وہ) چمپے کا ہار پہنتی ہے، تو اُسکے سنہرے بدن پر مطلق نظر
نہیں آتا، (ہمکو تو) اُس کے سینہ پر (اُسی وقت) دکھائی دیتا ہے، جب وہ
بالکل، کمھلا جاتا ہے (اور اُسکا چمپئی رنگ بدل جاتا ہے)" واہ، کیا اندازِ
بیان ہے۔ گو مبالغہ سہی، لیکن اِس بیان سے اک حُسن دوشیزہ کی کس درجہ
مکمل تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ ہار کا ذکر (گو وہ صرف اظہارِ رنگ کے
لیئے ہے) ہمیں تو معلوم نہیں کس عالم میں پہنچا دیتا ہے، اِسی کو کہتے ہیں
حُسنِ انتخاب، کہ چیز ایسی تلاش کی جائے جس سے قلب تڑپ کر رہ جائے

اور پھر یہ کمھلانا ، اُف ، خدا جانے ، کیا چیز ہے ؟ .

سَارِی ڈَارِی نِیل کی چُوک اچُوک چُکَیں

مُومَن مِرگ کرنر گہیو اَہو اَہیری نَین

"نیلی ساری (کے گھونگھٹ) کی اوٹ میں (یہ جو شکاری آنکھیں چھپی ہوئی ہیں
بے مثل قادر انداز ہیں، لیکن (اے شکاریو) اے آنکھو، آفرین، مرحبا تم پر کہ
میرے آہوئے دل کو تم نے تو رام ہی کرلیا ہے ، (یہ بات تو شکاریوں میں
نہیں ہوتی ، یہ تم کس انداز کے تیر چلانے والے ہو کہ مجروح کرنا تو در کنار
اُسپر اکبارگی قبضہ ہی کرلیتے ہو)" واقعی شکاری کا کام شکار کرنا ہے نہ کہ رام
کرلینا، اس میں یہ بات کسقدر خوب صورتی کے ساتھ دکھلائی ہے، کہ تمہارے
پاس تو صید خود آکے اطاعت قبول کرلیتا ہے. نیلی ساری کی تخصیص صرف
اِسوجہ سے ہے کہ صیاد ہمیشہ ہری یا نیلی ٹٹی کی آڑ میں بیٹھ کے شکار کھیلتے
ہیں -

مِل چَندَن بیندی رَہی گورے مُکھ نہ لکھائے

جیُوں جیُوں مَد لالی چڑھے تیُوں تیُوں اُگھرت جائے

ایک معشوق صندلی رنگ کی تعریف ہے کہ "اُسکے صبیح رُخ پر قشقہ (جو صندل کا ہوتا ہے

نظر نہیں آسکتا تھا لیکن اب جیسے جیسے نشۂ شباب کی سُرخی چہرے پر دوڑتی جاتی ہے، ویسے ویسے وہ تشنگی نمایاں ہوجاتی ہے،، نہایت کیف انگیز بات ہے۔

کنک لتا ہی نار ہے کٹ کا سے ہتے ہین
کٹ کا کنچن اینچ کے کچن ما نجھ بھر دین

کنک = سونا؛ لتا = شاخ؛ کٹ = کمر؛ ہین = نازک؛ کچن = سینہ؛

"اس سرو زریں کی کمر کیوں اسقدر پتلی اور نازک ہے؟ (معلوم ہوتا ہے کہ) اس مقام کا سونا نکال کے سینہ میں بھر دیا ہے"، مضمون آفرینی داد طلب ہے۔

بھتی مدھرتا ادھر ل کر سے دینی ڈار
لائی داتون اوکھ کی لوکھی کہہ مت گار

مدھرتا = شیریں؛ ادھر = لب؛ کر = ہاتھ؛

اس میں اک حسن بے خبر کا حال ہے اور اسکا قصہ یوں ہے کہ اس نے اپنی خادمہ سے مسواک مانگی، تو اس نے لاکے دیدی، لیکن "وہ لب شیریں سے ملکر میٹھی ہوگئی تو اس نے (غصہ میں آکر) ہاتھ سے پھینکدی (اور خادمہ پر عتاب ہونے لگا) کہ آئی کہیں سے بڑی انوکھی بن کے (میں نے تو مانگی

معمولی واتُن لور آپ) اونکھ (نیشکر) کی مسواک لے آئیں " اللہ اللہ کیا بے خبری ہے، کہ اب تک اس بات کا ہوش ہی نہیں کہ خود اُسکے لبوں ہی مزہ بدل گیا ہے، اِسمیں مسواک کا کیا قصور اور غریب خادمہ کیا کرے!
اسی رنگ کا ایک دوہا چھوٹی بحر کا جس کو ہندی میں بروا کہتے ہیں خان خاناں کا ہے، فرماتے ہیں:-

بَار بَار درزِن گھر جھگرت ٹھاڑھ
جُرٗی جوٗنٗی انگیا سیوت سوٗنٗی کاڑھ

وہ درزن کی دُکان پر بار بار (کھڑی ہوئی) جھگڑتی ہے کہ (یہ بات کیا ہے کہ میں روز تجھے) سینہ بند (درست کرنے کو) دیتی ہوں (اور) تو جب سیتی ہے ہمیشہ تنگ ہی کرتی ہے" جوشِ شباب، اور پھر اُسپر بے خبری کا عالم، اس سے زیادہ لطیف انداز میں بیان ہونا مشکل ہے۔ اُسکو یہ خبر ہی نہیں کہ غریب درزن تو اُسے روز ڈھیلا کر دیتی ہے، لیکن اُسکا چُست ہو جانا تو کسی اور وجہ سے ہے۔

ڈِیٹھ بَرَت، بَاندھی اُٹن، چڑھ دھاوَت نہ ڈرات
اِت اُت تیں مَن دُھن کے نَٹ لوٗ آوَت جات

دونوں اپنے اپنے کوٹھوں پر کھڑے ہیں، اِن کو "دو ستون" سمجھے، اور رشتۂ نگاہ کو جو یہاں سے وہاں تک قائم ہو گیا ہے، رسّی سمجھئے، اور اسکے بعد یہ تصور کیجئے کہ، جذباتِ قلب نٹ کی طرح اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر، اُسی رسّی (رشتۂ نگاہ) پر آتے جاتے ہیں۔" ابتدائی نگاہ شروع شروع کی الفت کا منظر دکھایا ہے، محبت کی پینگ بڑھ رہے ہیں۔ آپس میں سکھیاں، اُن دونوں کی خفیہ ملاقاتوں کا ذکر اس طرح کر رہی ہیں۔

مَانُو مُکھ دِکھَرَائِی دُولہَن کَرَ اَنُرَاگ
سَاس سُدَن، مَن لَلَن ہُوں، سُوتَنَ دِیُو سُہَاگ

عروس کی رسم رُونمائی میں عام قاعدہ ہے کہ، ہر ایک اپنی اپنی حیثیت کے موافق اُسکو کچھ دیتا ہے، اُسی کا حال اِس میں ظاہر کیا ہے کہ "نئی دولہن کی رونمائی میں ساس نے اپنا گھر اُسکے سپرد کر دیا، شوہر نے اپنا قلب نذر کر دیا (اتفاق سے اُسکی سَوت بھی اپنے عاشق (معشوق) کی عروس کو دیکھنے آئی تھی، اُسنے جو دیکھا تو باوصف اِسکے کہ اُسکو دیکھ کے جل جانا چاہیئے تھا، مگر عروس کے حُسن کا وہ عالم تھا کہ، سَوت نے اپنا سارا سُہاگ اُسکو دے ڈالا (جو اُسکی محبوب ترین چیز تھی، کہ اب یہ تیرے ہی لئے زیبا ہے)" نہایت دلفریب پیرایہ میں حُسن و کشش کی تصویر کھینچی ہے۔ اِس سے زیادہ اثر اور کیا ہوگا، کہ دشمن بھی اپنی محبت، اور معشوق سی

عزیز چیز قربانی کردے. "سَوتَن دِیُو سُہاگ" اِس دوہے کی جان ہے.

کہہ رَسِیس پَیاری اَلَکْ پِینی نُوکْ نَبینْ
مَانُو بَنسی مَدَن کی بِیدھن کو دِرگْ مِینْ

"رسیس" ۔ یہ تخلص ہے شاعر کا؛ "الک" ۔ زلف جو عارض و پیشانی پر پڑی ہو؛ "اے رسیس (یہ لٹکے) عارض پر تیز نوکدار زلف خمیدہ نہیں، (بلکہ یوں سمجھ کہ) حسن و عشق (کا دیوتا) آنکھوں کی مچھلیوں کا شکار کرنیکے لیے، بنسی (کانٹا) لگائے ہوئے ہے،، دل آویز تشبیہ ہے.

بِینْ کَاٹ جَلْ دُھوئیے، کھائیے اَدِھک پیاس
رحمن پِریْت سَراہیے مُوئے پِریْت کی آس

"مچھلی جب (پکڑ کے صاف کیجاتی اور) بنائی جاتی ہے، تو پانی سے دھوئی جاتی ہے، جب کھائی جاتی ہے، تو تشنگی غالب ہوتی ہے (کہ مجبورًا پانی پینا پڑتا ہے) تعریف تو اُس محبت کی ہے، جو فنا ہونے پر بھی اسقدر جذب آرزو رکھے".

مَنْ سے نہیں رحیم نِرپْ دِرگُ سے نہیں رَوانْ
دِیکھ نَینْ جِنہ آگرَیْ مَن تھی ہَاٹ بِک جَانْ

"اے رحیم قلب سا کوئی بادشاہ نہیں، اور نگاہ سے بہتر کوئی وزیر ندیم نہیں (جسکا یہ رسوخ و اختیار ہے کہ) جس کی عزت یہ کرے قلب اُسی کے ہاتھ بک جائے۔" یہ ہے لذت نظر کا فلسفہ۔

رحمن دھاگا پریم کا جن توڑو چٹکائے
توڑے سے جڑتے نہیں بیچ گانٹھ پڑ جائے

"رشتۂ محبت کو نہ توڑو۔ کیونکہ (ایک بار ٹوٹنے کے بعد اول تو) اس کا جوڑنا محال ہے (اور اگر کسی طرح جڑ بھی گیا تو) بیچ میں گرہ ضرور پڑ جائے گی۔"

جِنہہ رحیم تن من دِیو، کِیو ہِردے میں بھَون
تاسے دُکھ سُکھ کہے کی رہی کتھا اب کون

"جسکو اپنا تن من سونپ دیا، جسکو اپنے قلب میں جگہ دی، پھر اُس سے اب راحت و تکلیف کا ذکر ہی کیا؟ (تکلیف پہنچے تو، آرام ملے تو، مالک ہی جو چاہے سو کرے)" کسقدر جذبۂ عالی ہے، سبحان اللہ!

نیہہ نگر میں ڈرگ بیا نوکھے پرگٹ آئے
دونی من کو ایک من کر دینت بھاؤ بھراۓ

بادار محبت میں آنکھیں بھی عجیب دلاّل واقع ہوئی ہیں، کہ وہ من کو ایک من کرکے بھاؤ ٹھیرا دیتی ہیں (اور پھر لطف یہ کہ اس سودے کا ہر شخص طلبگار رہے)" یہ صنعت ابہام کی مثال ہے۔

دَگا دِیْن تَرُناپَنْ رَہو نہ ساتھ
جیُوں سَرچُوْکے بَہَلْیا مِیْنْجت ہاتھ

"ترناپن" = جوانی؛ "سَر" = تیر؛
"جوانی نے میرے ساتھ (کیسی) دغا کی (اور اب ایسا افسوس کررہا ہوں) جیسے کسی شکاری کا تیر خطا کرجائے اور وہ کفِ افسوس ملے"۔ اچھی بات کہی تشبیہ میں بہت بیساختہ پن ہے۔

بالم تور انگریاں اُولٹ سُبھاؤ
لاگت پیٹھ مَنْجھیاں اُر میں گھاؤ

"خلوت میں، محبت و خلوص کے ساتھ پیٹھ پر ہاتھ رکھ کے گفتگو کرنا، یہ وہ ادا ہے جس سے دل بہت متاثر ہوتا ہے۔
"وہ کہتی ہے کہ "پیارے تمہاری انگلیوں کی بھی (عجیب) اُلٹی خاصیت ہے، کہ لگتی ہیں پیٹھ پر اور زخم کرتی ہیں دل میں،، بہت رنگین دوہا ہے۔

للت شیام لیلا للن ڑھی چبک چھب دون
مدھ چاکھو مدھکر پروں گلاب پرسون

چبک = ٹھوڑی؛ پرسون = پھول؛
"یہ دلفریب سیاہ گودنے کا نشان اور بھی ٹھوڑی کے حسن کو دو بالا کر رہا ہے (یہ معلوم ہوتا ہے گویا) گلاب کے پھول سے بھونرا چمٹ کر (نہایت بدمستی سے) رس چوس رہا ہے"۔ اچھی تشبیہ ہے۔
کت سکچت ندھرک پھرو رتی او کھور تمیں
کہا کرو جو جائیں اے لگیں لگوہے نین

عورت کو معلوم ہو گیا ہے کہ اُسکا شوہر کسی دوسری سے بھی محبت کرتا ہے اور شوہر کو یقین ہے کہ اس بات کا علم اُسکی عورت کو ہو گیا ہے، اسلیئے جب وہ سامنے آتا ہے تو کچھ رُکا رُکا سا، شرمایا ہوا رہتا ہے، اسپر وہ یوں کہتی ہے کہ "تمہیں کیا فکر و غم ہے؛ بے دھڑک پھرو، تمہارا اسمیں قصور ہی کیا ہے؟ جب تمہاری آنکھیں خود ہی اُڑ لگنی ہوں، تو تم کیا کرو؟" میرے خیال میں اُسکا اس طرح تاویل کرنا، انتہائے محبت کی دلیل ہے، وہ اپنے شوہر کو، خواہ وہ کیسا ہی قصور کرے، نادم و خفیف نہیں دیکھ سکتی۔

رَہی پَکَر پاٹی سَر سُس بھرے بَھوَیں چِت نَین
لکھ سُپنے پی آن رَت جَگت ہو لاگت بَین

ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ لیٹی ہوئی سو رہی ہے، خواب میں اپنے شوہر کو دوسری عورت کے ساتھ ملتفت پایا، تو چونک پڑی، اور شوہر کو اپنی ہی بغل میں موجود پایا، تو کہتا ہے، کہ "خواب میں اپنے پی کو دوسری کے ساتھ دیکھ کے (گو اُسکا وہم و خیال ہی تھا اور کچھ نہیں) جاگ اُٹھنے پر بھی متامّل ہے (اُسکو یقین نہیں آتا کہ یہ غلط ہے، اور اسی خیال سے متاثر ہو کر) ایک طرف ہو کر، پٹی پکڑے، نہایت پُر رشک جنون سے اپنے شوہر کو دیکھ رہی ہے (کہ کیا عجب ہے میں نے صحیح ہی دیکھا ہو) انتہائے رشک کی تصویر کھینچی ہے اور نہایت خوب کھینچی ہے۔

بھَوں ڈانڑی، کانٹو تلک، پَل پٹ، پُتلی باٹ
مُورت تُولت مت تر کی نیہہ نگر کی ہاٹ

"اُسکی ابرو تو شاہین ترازو ہے، تلک (اک نشان مثل الف کے سیدھا دونو ابروؤں کے درمیان صندل سے کھینچتے ہیں) کانٹا ہے، حلقہائے چشم ترازو کے پلّے ہیں اور پُتلی باٹ ہے کہ" (اِس شان کے ساتھ وہ بازارِ حسن میں

محبت سنج ہے":

چھب سبجی پنیو دِرگن تم کت دیو سکھائے
اب اُلن واہی بنا چھن بھر رہو نہ جائے

"اے آنکھو، تم کو حُسن کی سنہری پینا کس نے سکھا دیا، کہ بغیر اُس مشغلہ کے دم بھر بھی چین نہیں آتا" عمدہ بات کہی ہے۔ "چھن بھر رہو نہ جائے" اِس دوہے کی جان ہے۔

کن دینو سونپو سسر بہو تھوڑ ہتی جان
روپ رہنچ ٹے لگ رہو سب جگ جانچک آن

"خسر (صاحب) نے خیرات کا غلہ تقسیم کرنا بہو کے سپرد کیا یہ خیال کرکے کہ اُسکے ہاتھ چھوٹے چھوٹے ہیں (صرف کم ہوگا)۔ (وہاں یہ حالت ہوئی کہ) اک عالم اُس کے حُسن کا (نادیدہ) مشتاق بن کے، خیرات لینے کو جمع ہو گیا"

کریں چاہے سو چنک کے کھڑے اُوڑ ڈھے مین
لاج نوائے ترہپرت کرت کھوند سی نین

اس دوہے میں آنکھ کا ذکر ہے اور عنفوانِ شباب میں اُسکے بیقرار مگر پُرحیا

حالت کو اک نہایت دلچسپ تشبیہ کی صورت میں دکھلایا ہے، کہتا ہے کہ :۔
تقاضائے جوانی تو اُسکی آنکھوں کو اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ اِدہر، اُدہر نہایت
بیباکانہ اور آزادانہ پہریں، لیکن (جس طرح، جب نئے بچھیرے کی چال نکالی جاتی
ہے، اور لگام خوب کھینچ کے پیچھے کو باندھ دیجاتی ہے، اور اُسکی گردن میں ایک
خوب صورت خم پیدا ہو جاتا ہے، جس سے سر اور آنکھیں اوپر کو نہیں اُٹھ سکتیں،
اور پہر بھی وہ شوخی اور کھلنڈرے پن میں جلدی جلدی پیروں سے زمین ہی کھوندنے
لگتا ہے، جسکو کھوند کرنا کہتے ہیں، ویسی ہی حالت اُسکی آنکھوں کی ہی، کہ گو
شرم و حیا کی باگیں اُسے روکے ہوئے ہیں، لیکن وہ اُڑ نکلنے کے لیے بیقرار
ہو رہی ہیں۔" آنکھوں کا شرم و حجاب کی روک تھام سے بچھیرے کی طرح کھوند سی
کرنا نہایت پاکیزہ اور سریع الانتقال الی الذہن حالت آنکھوں کی بیقراری و
شوخی کی ہے۔

یَدَپ چڑا اُن چنچلی چپلت چھوُں اُور دِس سَیَن
تَرَپ نہ چھانڑت دُوہن کی ہنسی رسیلے نین

یہ دوہا نہایت پاکیزہ ہے، اور محبت کے رمز و کنایہ کی بڑی دلفریب حالت دکھلائی
ہے۔ کہتا ہے کہ "گو تمام جگہ اُن دونوں کی محبت ظاہر ہو گئی ہے، اور بدنامی
طعن و تشنیع ہو رہی ہے، لیکن پہر بھی اُنکی یہ حالت ہی (کہ جب کبھی الجھاتے ہیں)

تو آنکھیں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھکر متبسم ہو ہی جاتی ہیں" ایک دوسرے کو دیکھکے آنکھوں کا مسکرا دینا، یہ وہ حالت ہے، جسکا لطف کچھ وہی لوگ اُٹھا سکتے ہیں، جنکے قلب کبھی اس قسم کے تبسم سے مجروح ہو چکے ہیں اسمیں شک نہیں کہ شاعر بڑا معاملہ فہم تھا۔

اَونْدھائی سیسی سُوکُھو بِرَہ بَرِی بِلَلَاتُ
بِیچ سُوکھ گُلَابُ گیَو چھینٹو چھُوئی نَہ گاتُ

سکھی کہہ رہی ہے کہ" میں نے جو اُسکو آتش محبت میں جلتے اور تڑپتے دیکھا، تو (محض اس خیال سے کہ اُسکو کچھ سکون ہو جائے) گلاب کی شیشی اُس کے جسم پر اُنڈیل دی، لیکن اُسکے جسم میں کس بلا کی تپش تھی کہ) سارا گلاب بیچ ہی میں خشک ہو گیا، اُسکے جسم تک تو ایک قطرہ بھی نہ پہنچ سکا" اس میں ایک بات تو یہ اچھی ہے کہ گلاب کو اُسکے جسم تک پہنچنے ہی نہ دیا اور راستہ ہی میں خشک کر دیا، یوں کہنا بھی ممکن تھا کہ جسم میں لگاتے ہی سارا عرق خشک ہو گیا، مگر اُس میں جسم کی آنچ کا اظہار نہوتا، دوسرے اسمیں یہ ابہام بھی ہے کہ شعلۂ مفارقت سے پھنکنے والے کو اسباب تعیش کچھ نفع نہیں پہنچا سکتے اور نہ اُن سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔

برہ بری لکھ جوگنو کھ آئی کے بار
ارے آو بھج بھیترے برست آج انگار

یہ دوہا بھی سکھی کی طرف سے ہے کہ "اُس سوختۂ مفارقت نے جگنو دیکھکر کئی دفعہ (مجھ سے) کہا کہ اندر بھاگ چلو آج تو (غضب کے) انگارے برس رہے ہیں۔" موسم برشگال میں، جب مینہ برس رہا ہو، اندھیری چھائی ہو، اور ایک مہجورِ بلا اپنے پی سے جدا ہوکر تڑپ رہی ہو، اُسکو بھلا، جگنو کی چمک کیا بھلی معلوم ہوسکتی ہے، اُسکے حق میں تو کرمک شب تاب واقعی انگاروں سے کم نہیں جو اُسکی بے قراری اور تپش میں اور اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ اس دوہے کا یہ اندازِ بیان کہ "اری آو بھج بھیترے برست آج انگار" بہت خوشنما ہے۔

کہے جو بچن بیوگنی برہ بکل اکلائے
کئے نہ کو انسوا سہت سوا سو بول سنائے

"اُس غمزدہ کے منہ سے (جو) الفاظ شدت کرب سے مجبوراً نکل گئے تھے (گو انکو کسی نے نہ سنا تھا، کیونکہ اُسنے بالکل تنہائی اور سناٹے میں کہے تھے) لیکن (میاں) مٹھو نے جو انکو سب کے سامنے دوہرایا تو سب کے آنسو بے اختیار نکل پڑے"، جس کوٹھری میں بیٹھی ہوئی وہ اپنا درد و مصیبت کا بیان، سائیں

سُسر کے خوف اور شرم کی وجہ سے، خاموشی کے ساتھ تنہائی میں کر رہی تھی
وہاں ایک پنجرہ میں سُوا (طوطا) موجود تھا، وہ سب سُن رہا تھا، جب حضرت
باہر نکال کے ٹانگے گئے، تو اُس غریب کی ساری کتھا دُہرادی، گھر والے سب
سمجھ گئے اور اِسقدر متاثر ہوئے کہ آخر آنسو نکل ہی پڑے، اِس میں سُوا کی
زبان سے اُسکی تکلیف کا اظہار معاشرت ہندوستان کے لحاظ سے نہایت
موزوں ہے. کیونکہ عورت کسی کے سامنے گھر میں اپنی محبت اور اُلفت کا
اظہار اپنے شوہر کی یاد میں اشارتًا یا کنایتًہ کر ہی نہیں سکتی.

کوٗٹ جتن کوءُ کرے تن کی تپن نہ جائے

جَو لوں بھیجے چیر لوں رہے نہ پیو لپٹائے

یہ بھی سکھی کی طرف سے ہے، جو اُسکی تسکین کے لیئے سب ترکیبیں کر چکی ہے
اور آخر میں تھک کے کہتی ہے کہ "کوئی لاکھہ تدبیریں کرے، تیرے بدن کی
تپش موقوف نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ تیرا پی تیری ترساری کی طرح کی تجھسے
نہ لپٹا رہے یا تو اُس سے ترساری کی طرح لپٹی نہ رہے." اس میں ترساری کا
تخیل بہت کیف افزا ہے، ایک تو یہ لباس خود ہی اسدرجہ دلفریب اور جاذب
نظر ہے جسکی انتہا نہیں، دوسرے اُسپر اُسکا تر ہونا. شدتِ مواصلت کا
تخیل اِس سے زیادہ اور پاکیزہ انداز میں کیا بیان ہو سکتا ہے. ایک تپ مفارقت

تڑپنے والی نازنین کا مثل اپنی تر ساری کے کسی کے بدن سے لپٹا ہے
خدا جانے یہ کیا ہے۔

چھپیو چھبیلی مُکھ لسے نیلے آنچل چیر
مَنُو کلانِدھ جھلملے کالِندی کے نیر

کلانِدھ = چاند؛ کالندی = جمنا؛
"نیلی (ساری کے) آنچل کے اوٹ میں، اُسکا مُنہ ایسا نظر آتا ہے، جیسے
جمنا کے پانی میں چاند جھلملاتا ہو"۔ اِسمیں صرف جھلملانا اک ایسا لفظ ہے
جس سے شاعر کی قادر الکلامی اور رسائی ذہن اچھی طرح ثابت ہوتی ہے
جس طرح گھونگٹ کی اوٹ میں چہرہ صاف نظر نہیں آتا، بلکہ کپڑے کی بناوٹ
سے کہیں کہیں اُسکی ضو رنگ کھلائی پڑتی ہے، اسی طرح جمنا میں بھی لہروں کی وجہ سے
جو چاند کا عکس پڑتا ہے، اک جگہ قائم نظر نہیں آتا۔

اَتِہی گرجَن بولیت کہار نہو رِسے توئے
تو پیارا مو جیو کا، مو جیو پیارا ہوئے

یہ دوہا بہاری لال کے منتخب دوہوں میں سے ہے، اور اسمیں کلام نہیں کہ بہت
ہی پاکیزہ ہے، اک نازنین اپنے پی سے خفا ہوگئی تھی، اُس نے بمشکل تمام راضی

کیا۔ اور جب وہ اُن سے مخاطب ہوئی تو وہ حضرت روٹھ گئے۔ اس لیئے اب کسقدر دلکش اور متاثر پیرایہ میں منا رہی ہے کہ "اے پیارے، میں جو تجھ سے بولتی ہوں اسمیں کچھ تجھپر احسان نہیں کرتی، بلکہ غرض تو مجھے ہی، کیونکہ تو میرے قلب کا محبوب ہے، اور میرا دل خود مجھے عزیز ہے (اگر نہ بولیں تو خود اپنے اوپر ظلم کرنا اور یہ کیسے گوارا ہو سکتا ہے؟)" دوست کا دوست دوست ہوتا ہے۔ دوسرے کی میں نہیں کہہ سکتا، لیکن میری نگاہ سے جس وقت یہ دوہا گزرا ہے، گھنٹوں کیف رہا ہے۔ اُف، اک نازنین کا اس انداز سے، اس محبت پاش لجاجت سے منانا، کسقدر کلیجہ کو شق کر دینے والا ہے۔ عورت کی بے اعتنائی تو خیر تکلیف دہ ضرور ہے، لیکن اُسکی محبت، اور بھی مہلک و تپش افزا ہے۔ بہرحال حُسن اپنے سے دور ہو تو، اور نزدیک ہو تو، دونوں حالتوں میں تکلیف پہنچانے والا ہے۔

جب نگاہِ بے محابا کا میں لذت یاب تھا　　جب شعاعِ حُسن سیمیں سے جگر سیراب تھا
دستِ نازک جب مرے سینہ پہ جذب خواب تھا　　ہائے یہ کمبخت دل اُس وقت بھی بیتاب تھا

حُسن تھا میرے قریں، لیکن مٹا جاتا تھا میں
آتشِ ہجراں نہ تھی، لیکن پُھنکا جاتا تھا میں
(نیاز)

اُو ٹھ ٹھگ ٹھک اِیتو کہا پاہ سِن کے اُبھسار

جَانْ پَرَیگی دِیکھبو دَامِن گھَن اَندھیَار

برسات کا زمانہ ہے، اندھیری راتیں ہیں، نہایت کوشش وسعی سے اسکی سکھی نے اک موقع نکالا ہے کہ وہ اپنے پی سے مل لے۔ اوراب وہ اُسکو بلانے آئی ہے کہ چل۔ وہ یہ سُنکر سامان چلنے کا کرنے لگی اور اِس قسم کا ملبوس زیب بدن کرنے لگی، جس سے کوئی پہچان نہ لے۔ اِسپر دیر ہوتے دیکھکر کہتی ہے کہ "بس چلو اُٹھو بھی برسات کے موسم میں اِسقدر کھٹراگ اور احتیاط کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی اتفاق سے تمہیں دیکھ بھی لیگا تو اِس زمانہ بارش میں یہی سمجھے گا کہ بجلی چمک گئی (تمہارے ہونے کا کسی کو شبہہ بھی نہ ہوگا" کس قدر دلچسپ بات ہے +

تجیو آنچ اَتْ برہ کی رہیو پریم رَسْ بھیج

نینَنْ کے مَگْ جَلْ بہے ہیو پسیج پسیج

معلوم ہوتا ہے عمل قرع انبیق کو دیکھکر یہ مضمون پیدا کیا گیا ہے کہ:۔

"محبت کی رَسْ سے تو اندرونی حصہ تر تھا، مگر مفارقت کی آنچ نے باہر سے ایسا کھولایا کہ قلب پسیج پسیج کے آنکھوں کی راہ سے پانی ہوکر بہنے لگا"

ہُوئے کپور مَنْ مَیں رَہی، مِل تَنْ دُتْ مُکتالْ

چھن چھن کھڑی چھُپتی چھُپو اسے تُرنالْ

کپور = کہربا؛ ترنال = پرکاہ؛۔ موتیوں کا اُسکے رنگیں سینہ سے ملکے سنہرے

رنگ کا ہو گیا ہے، (اُسکی سکھی) نہایت حیرت سے کھڑی ہوئی، گھڑی گھڑی تنکا لگا لگا کے اُس مالے کو دیکھ رہی ہے کہ کہیں یہ کہربا کا تو نہیں (کیونکہ اگر کہربا ہوگا تو تنکا ضرور اس طرف کھنچ جائے گا۔)" اسمیں اُسکے رنگ بدن کی تعریف ہے کہ اُسکی چھوٹ موتیوں کے ہار کو بھی کہربا (زرد) کے رنگ کا بنائے ہوئے ہے، اِسمیں نزاکت یہ ہے کہ وہ سکھی جو ہر وقت کی انیس و ہمدم تھی اور جس نے خود اپنے ہاتھ سے موتیوں کا مالا اُسکو پہنایا تھا، وہ ہو کا کھا رہی ہے اور وہی سمجھ رہی ہے کہ یہ موتی نہیں ہیں بلکہ کہربا کے دانے ہیں، تنکے سے مَس کر کے دیکھنا، اسمیں چاہے سکھی کی ادا کی داد دیجئے، چاہے شاعر کی نازک خیالی پر محمول کیجئے۔ بہرحال ہے بہت پاکیزہ اور مزیدار بات۔

مَا نُو بِدھ تَنْ اَچھ چھَب سُچھ رَا کھے کَاج

دِرگ پگ پُوچھَن کُو کِئے بھُوشَن پَا اَنْدَاج

"اِس غرض سے کہ اُسکا حُسن میلا نہو، پائے نگاہ کے لیئے زیور پا انداز ہے" یہ سارا خلاصہ اس دوہے کا ہے، اور ہندی شعرا کے نزدیک بہاری لال کے اعلیٰ ترین دوہوں میں سے ایک یہ بھی ہے، مگر میری رائے میں، کوئی بات اس میں ایسی نہیں جس سے یہ دوہا اسقدر قابل تعریف سمجھا جائے، اگر حُسن کو اس درجہ شفاف اور نازک دکھانا کہ پائے نگاہ سے میلا ہونیکا محتمل ہو، ضرور نازک

خیالی ہے، لیکن چونکہ یہ دوہا جذبات وجدّت سے معرّا ہے، اس لیے زیادہ قابل تعریف نہیں.

پہرَنہ بھُوشَن کَنَک کی کہہ آوَت اِہ ہیت
دَرپن کاسا مُورچہ دیہ دِکھائی دیت

"سونے کا زیور نہ پہن، تیرے جسم پر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے آئینہ میں مورچہ نظر آتا ہے.

لے چُبھکی چلی جات جِت جِت کیل اَدھیر
کیجت کیسر نیر سوں تِت تِت کیسر نیر

چُبھکی = غوطہ؛ کیسر = زعفران؛
ایک تالاب میں اپنی سکھیوں کے ساتھ ایک نازنین نہانے گئی، اتفاق سے اُسکا معشوق بھی دوسری طرف نہا رہا تھا. جب اُس نے نہانا شروع کیا تو اندر ہی اندر غوطہ لگا کر اپنے ادھیر (محبوب) کی طرف جانے لگی، اور خیال یہ کہ سکھیاں پانی کے نیچے کیا سمجھ سکیں گی، کہ میں کہاں ہوں، لیکن یہ بات نہ چُھپ سکی، اور ایک سکھی دوسری سے بولی کہ:-
"جس طرف اُسکا حبیب جاتا ہے، اُسی طرف یہ بھی غوطہ لگا کے پہنچتی ہے"

(دیکھونا) جدہر جدہر اُسکاپی پانی سے کھیلتا ہوا جاتا ہے۔ اُسی طرف پانی کی زعفرانی لکیر بڑھتی چلی جاتی ہے۔" مطلب یہ کہ پانی اُسکے زعفرانی بدن سے مِل کے اُسیکا رنگِ جسم قبول کرتا ہے۔ کیا کرے اُس نے تو لاکھ کوشش کی کہ کسی کو پتہ نہ چلے، لیکن اِسکو کیا کرے۔ جب اُسکا حُسن خود اُسکا غماز بن جائے بڑا پیارا اندازِ بیان ہے۔

چِتون بھُورے بھائے کی، گُورے مُکھ مُسکیان

لگن لٹک آلی گرے، چِت کھٹکت نِت آن

آلی = سکھی؛ کہتا ہے کہ" (یہ تین باتیں اُسکی) میرے دل میں ہر وقت کھٹکتی رہتی ہیں۔ ایک تو اُسکی بھولی چِتون، دوسرے اُسکے رُخ صبیح کا تبسم، تیسرے اپنی سکھی کے گلے میں (باہیں ڈالکے) لٹک جانا" ہم بھی تصدیق کرتے ہیں کہ یہ ادائیں ضرور کھٹکنے والی ہیں اور خاصکر تیسری ادا تو جسقدر بھی ظلم و ستم کرے کم ہے۔ عنفوانِ شباب ہیں، کہ ابھی پر تصنع گھاتیں نہیں سیکھیں۔ یہ ادائیں اک عالم مار رکھنے کیلئے کافی ہیں، خدا معلوم یہ معصوم ادائیں کتنے لوگوں کو گنہگار بنائینگی۔

چھِن چھِن کھٹکت سوہیئے کھڑی بھیڑ بس جات

کہی جو چلی بن ہیجتے اُدنٹھن ہی میں بات

"حالانکہ وہ ایک گروہ میں سب کے ساتھ جارہی تھی، اور کوئی موقع نہ تھا کہ وہ میری جانب مخاطب ہوتی لیکن پھر بھی بغیر دیکھے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اُسکا کچھ مجھ سے کہہ دینا اس وقت تک میرے قلب میں خلش افزا ہے" خلش کی بات ہی ہے جو رموز محبت اور حُسن و عشق کی گھاتوں سے واقف ہیں وہ اس ادا کی پوری داد دے سکتے ہیں، ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہیں کلیجہ پکڑکے بیٹھ جاتا تھا۔

کَتَ دِرگُ بھَرے سُبال، ہَمَ آیُو بھَایُو نہین
ڈِلے دِرگُن کھال مَلِنْ بھَیۓ توُ وُ درش بِنْ

اس دوہے کے پہلے مصرعہ میں مخاطب مرد ہے، اور دوسرے میں عورت کی طرف سے اُسکا جواب ہے۔ شوہر جو عرصہ کے بعد پردیس سے لوٹ کر آیا، تو فرط مسرت سے اُسکی بیوی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس حالت کو دیکھکر شوہر چھیڑتا ہے کہ:-

"تمہاری پُرآب آنکھیں (کیوں) ہیں، (معلوم ہوتا ہے) میرا آنا (شاید) ناگوار ہوا ہے" وہ جواب دیتی ہے کہ "یہ بات نہیں بلکہ، میری آنکھیں جو تمہارے فراق میں بیمار ہوگئی تھیں (آج تمہارے آنے سے صحتیاب ہوئی ہیں) یہ اُنکا غسل صحت ہے"

پی سنگ بولن ہنس ہیں سب دن سب رت ٹھیک
پرہمتیں ارسسر تیں گرگھم کی رت ٹھیک

پرہمتیں - برف باری؛ سسر = ایام سرما؛ گرگھم = ایام گرما؛
اِس دوہے میں اُس عورت کا ذکر ہے، جو بے انتہا نازک ہے اور جس نے نہایت لطیف طبیعت پائی ہے، اور اِس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتی ہر وقت اور زیادہ عرصہ تک اُس کے نازک جسم سے فائدہ اُٹھایا کرے۔ کہتی ہے کہ:-
"یوں تو پی سے ہر وقت ہنسنے بولنے کے لیے (ہمیشہ ایک سا زمانہ ہے) کوئی موسم اور کوئی دن ہو موزوں ہے، لیکن بہ نسبت جاڑوں کے ایام گرما زیادہ مناسب ہیں، (کیونکہ گرمی کی راتیں مختصر ہوتی ہیں)"

پی مورت میری سدا راکھت درگن بسائے
ڈرپت یہ گوری دیہ مت سانوری ہو جائے

کہتی ہے کہ "میرے پی ہر وقت میری صورت کو اپنی آنکھوں میں بسائے رہتے ہیں (مجھکو اپنی آنکھوں سے جدا نہیں ہونے دیتے)؛ ڈرتی ہوں، کہیں یہ گورا (بلوری) جسم (اُن کی سیاہ پتلیوں کے اثر صحبت سے) سانولا نہ ہو جائے"
اِس میں اشارہ اِس امر کی طرف بھی ہے، کہ یہ ہر وقت کی مواصلت، یہ اُنکا شغف

حسن کو زائل کردینے والا ہے، یا یہ کہ قدر گھٹا دے گا، بہرحال جو کچھ بھی ہو، وہ بار نگین و پرمزہ ہے، ہمارے نزدیک اسکو یہ کرنا چاہیئے، کہ بجائے پتلیوں میں بسنے اور رہنے کے، آنکھوں کی سپیدی میں سُرخ ڈورے بنکر رہے، اور یہ اُسکے اختیار کی بات ہی۔

کَاحِیُتْرائیَ جُو نہ ہُوا ایک کلاَ مِیں جِیت
آج لَلاَ مَنَ کُو کرُوں ہَات چھلاَ کی رِیت

اپنے محبوب کے پاس نہایت آن بان کے ساتھ جاتے ہوئے اپنی سکھی سے کہتی ہے کہ "اگر ذرا سی بات میں فتح نہ حاصل کرلی تو ہُشیاری ہی کیا؟ (تو سہی جو) آج حضرت کا دل اس طرح قبضہ میں کریوں، جیسے کوئی ہاتھ میں چھلّا پہن لے۔" ہائے، کیا بات کہی ہے، جیسے کوئی ہاتھ میں چھلّا پہن لے، کس قدر پُر مغز، اور پُر مفہوم بات ہی، جس طرح چھلّا نہایت آسانی سے ہاتھ میں پہن لیا جاتا ہے، اور یوں یکایک اُنگلی سے نکل بھی نہیں سکتا، اسی طرح وہ دل پر نہایت سہولت کے ساتھ قبضہ کرنا، اور پھر اپنے قابو سے باہر نہ جانے دینا ظاہر کرتی ہے، اور پھر عورت کا یہ کہنا کہ چھلے کی طرح اُنگلی میں پہن لوں، صرف اتنا کہہ دینا ہی اک عالم کو حلقہ بگوش بنانیکے لیئے کافی ہے، چہ جائیکہ اس کے لیئے اُسکی سعی۔ علاوہ اِسکے اِس بات کے کہنے سے عورت کی کِسقدر محبت

مترشح ہو رہی ہے کہ "میں تو اپنی اُنگلی کا چھلا بناؤنگی" یعنی اِس طرح رکھونگی جس سے ہر وقت سامنے رہے، اور آنکھوں سے اوجھل نہو۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس چھلے، انے دوہے میں چار چاند لگا دیئے؛

بَاما، بھاما، کامنی کہہ بولو پرِ دیس
پیاری کہت لاجت نہیں پاوَس چلے پرِدیس

یہ اُس موقع کا دوہا ہے، جب شوہر باہر سفر کے لیئے آمادہ ہے، اور عورت یہ دیکھہ دیکھہ کے بیقرار ہو رہی ہے۔ اُسکا کرب دیکھہ کے شوہر نے نہایت پیار سے اُسے سمجھانا شروع کیا، جب اِس نے کہا کہ "تمہیں شرم نہیں آتی، کہ مجکو پیاری، کامنی، وغیرہ سب ہی کچھہ کہتے ہو، اور پھر اِس زمانہ بارش میں باہر جانے کی (مجھہ سے جدا ہونے کی) بھی تیاریاں کر رہے ہو" یہی موقعے ہیں جب جری سا جری آدمی بھی بُزدل ہو جاتا ہے، کَون ایسا سنگدل ہوگا، جو اِس کے سُننے پر بھی عازم سفر رہے۔ نہایت موثر، اور دلفریب دوہا ہے۔

مانُو کہی رَہَسِیں کی سَر چُونَر ڈھک لیو
جُوڑو بھر یُورو جھَراپاہ نگھُرَن دیو

آپ از مہربانی کر کے اپنا منہ (کے آنچل) سے سر ڈھک لیجئے، اس جھڑ سے ہم

جوڑے کا زہر نہ پھیلنے دیجئے،، معمولی بات ہی، لیکن صرف اس لیے درج کیا گیا کہ وہ چار دوہوں سے حضرت رسیس کا بھی رنگ ظاہر ہو جائے۔

سمجھایو بہتا یو نہیں، اُن کھایو بس گھور
اُدناسے سُدھ ناپچھو گدنالکھے گئے تور

اس دوہے میں سکھی نائکہ سے اُسکے عاشق کا حال بیان کر رہی ہے کہ:۔
"میں نے بہتیرا سمجھایا، لیکن کچھ نتیجہ نہوا، آخر کار اُنھوں نے زہر گھولکے پی ہی لیا، وہ تو جسدن سے تیرے گونے اُس نے دیکھے تھے، جبھی سے بدحواس تھا"

بَال کہا لَالی بھئی لوئن کوئن مانھ
لَال تمہارے درگن کی پڑی درگن میں چھانھ

کسی نازنین کا پی ایک شب مکان سے باہر کہیں رہا ہے، اور اس رشک اور جلن کی وجہ سے اُس نے ساری رات جاگ کر اشک باری کیحالت میں کاٹی ہے۔ صبح کو جب وہ حضرت گھر تشریف لائے تو اپنی خفت مٹانے کی وجہ سے، آتے ہی اُس بیچاری پر الزام رکھا کہ "یہ تمہاری آنکھوں میں سرخی کہاں سے آئی؟ (کچھ حال تو کہو)" اُس نے جواب دیا کہ "تمہاری آنکھوں کی

سُرخی کے انعکاس کی وجہ سے میری آنکھیں بھی سُرخ ہوگئی ہونگی، تھیں دونوں کی آنکھیں سُرخ، ایک کی پرعیش رات گزارنے کی وجہ سے، دوسرے کی رات بھر رونے کے سبب سے، لیکن عورت کا جواب کیسا مُسکت ہے۔

انیارے، دیرگھ نین، کتی نہ ترن سمان
وہ چتون اور کچھو جہ بس ہوت سوجان

"آنکھوں کا بڑا اور نکیلا ہونا تو کوئی بات نہیں، (اکثر دیکھنے میں آجاتا ہے) لیکن وہ چتون، جس سے کوئی (ذی فہم) بس میں آجائے، کچھ اور ہی چیز ہے۔" نہایت پاکیزہ بات لکھی ہے، گو اس میں نہ کوئی تشبیہ ہے نہ استعارہ، مگر ایک معمولی بات جو بے ساختگی سے ظاہر کردی گئی ہے، تو قلب کس درجہ متاثر ہے۔

میں ہی بوری بِرہ بس بھئی کے بورا سب گانوں
کہا جانِ کہت ہیں سسہی ست کرناؤں

"میں (تو سمجھتی تھی کہ اک میں ہی) آتش محبت کی وجہ سے دیوانی ہوگئی ہوں، مگر نہیں، سارا گانوں کا گانوں پاگل معلوم ہوتا ہے، ورنہ چاند کو کیوں سب ٹھنڈک پہنچانے والا کہتے ہیں" مطلب یہ کہ چاند باوصف اسکے کہ خنکی بخش

مشہور ہے، لیکن میرے لیئے تو وہ اور بھی تڑپا دینے والا ہے۔ شب مفارقت ایک تو یونہی بلائے بد ہے اور اگر کہیں اتفاق سے چاندنی بھی ہوئی، تو اسمیں شک نہیں کہ اک مہجور کے لیئے اور بھی ستم بالائے ستم ہے"

رُوپ سَوَاد کو دِرگن سَم، جُھپکل لیتے جان

ہَت لکھیت ہوتے نہیں یہ رنج آگے آن

"اگر پلکیں بھی مثل آنکھوں کے لذت کش نظارہ ہوتیں، تو اُنکا گھڑی گھڑی کا دم نظارہ حرکت کرنا کبھی نہ ہوتا"، نہایت نازک بات کہی ہے۔ محو دیدار کو آنکھوں کا جھپکنا تک گوارا نہیں۔ "نظارہ زجنبیدن مژگاں گلہ دارد"۔

اور چوٹن بچ جات ہے کچھک پائے کے اوٹ

پلک اُوٹ پریتم بھئے لاگت دونی چوٹ

یہ دوہا رسندھ کا ہے اور نہایت پر لطف ہے کہتا ہے کہ:-

"اور چوٹیں تو ایسی ہیں کہ کسی چیز کی اوٹ کر دو، تو کچھ نہ کچھ حفاظت ہو ہی جاتی ہے، لیکن ذہائے رے، محبت جسکی ساری باتیں دنیا سے نرالی ہیں کہ محبوب اور معشوق اگر ذرا بھی پلکوں کی اوٹ ہو جائے، تو اور دونی چوٹ لگتی ہے"، کسقدر پیاری تلاش ہے، سبحان اللہ

کچ سمیٹ بھج کر اُولٹ، کھڑی سیس پٹ ڈار

کاکو من باندھے نہ یہ جوڑا باندھن ہار

کچ = بال زلف؛ بھج = ہاتھ؛ سیس = سر؛

ایک نازنین بستر خواب سے اُٹھی ہے، اور اپنی زلف پریشان کو سنبھال کے جوڑا باندھ رہی ہے، اِس ادا سے متاثر ہو کر دیکھنے والا کہتا ہے کہ "اُس سہی قد کا) کھڑے ہو کے، اپنے (گورے) بازوؤں کو اٹھا کر، بالوں کو سمیٹنا اور پھر ایک آنچل کا (نہایت خوبصورت انداز سے) سر پر ڈالکر جوڑا باندھنا یہ انداز معلوم نہیں کس کس کے قلب اپنے قبضہ میں کرلیگا"، جنھوں نے کبھی کبھی عورت کے اِس اندازِ خاص کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے، وہ اِس مصور شاعر کے کلام کی داد دے سکتے ہیں۔ خاصکر ساری کے آنچل کا سر پر پڑا ہونا، اور بازوؤں کے بلند ہونے کی حالت میں جسم کے ایک حصہ کا نمایاں ہو جانا، یہ وہ مستقل ادائیں ہیں، جو بلا خیالِ بندشِ جوڑا، خود ہی کچھ کم تڑپانیوالی نہیں ہیں اور اسی کو شاعرانہ لمحہ (Poetic moment) کہتے ہیں، لیکن کسے نصیب؟

تنئے کت کمیتی پڑھی بن جہ بھوِ نہ کمان

چت بیدھے چوکت نہیں، بنک بلوکن بان

کمینیتی = فنِ تیر اندازی؛ چہ = زہ؛ بلوکن = نظر؛ بان = تیر؛

"(یہ) تونے (اے نازنین) فنِ تیر اندازی کہاں سے سیکھا، کہ ابروؤں کی کمان ہے جس میں زِہ نہیں، نظر کے تیر سے جو سیدھا نہیں، حواس اور خیال (ایسی متحرک اور غیر مستقر چیز) کا نشانہ نہیں چوکتی، اور اسکو فوراً بیندھ لیتی ہے" اسبابِ شکار تو ظاہر میں ایسے نامکمل ہیں کہ کمان ہے تو زِہ نہیں اور تیر ہے تو اُسمیں راستی نہیں، جو ضروری ہے، لیکن پھر بھی قادر اندازی کا وہ عالم ہے، کہ خیال ایسا متحرک ہدف بھی اُڑا دیا جاتا ہے،

چمچمات چنچل نین بچ گھونگٹ، پٹ جھین

مانھو سرسرتا بمل جل اُچھلت جُگ مین

سرسرتا - گنگا؛ بمل - پاک؛ جگ - دو؛ مین - مچھلی؛

اس دوہے میں آنکھوں کا ذکر ہے، کہتا ہے کہ "اُسکی چنچل آنکھیں، باریک گھونگٹ کی اوٹ میں، ایسی نظر آتی ہیں، گویا گنگا کے صاف و پاک پانی میں دو مچھلیاں اُچھل رہی ہیں" ہندی زبان میں آنکھوں کو مچھلیوں سے تشبیہ دینا عام ہے، اردو فارسی میں میری نگاہ سے نہیں گزری، ممکن ہے کہ ہو مگر میرے علم میں نہیں۔ میری رائے میں آنکھوں کی بے چینی اور بیقراری دیکھتے ہوئے اُنکو مچھلی کہنا نزاکت کی بات ہے۔ اور خاصکر جب وہ سپید'

مگر باریک ریشمی ساری کے گھونگٹ میں ہوں۔ اِسکے لیے ضرورت ہی کہ پہلے انسان اُس وقت کی حالت کو پیش نظر رکھے ؛ اور پھر اِس کا لطف اُٹھائے۔

جَٹت نِیلُ مَنُ جَگمگت سِینک سُوہائی ناک
مَنُوْ اَلی چمپک کلی بَسُ رَسُ لیت نِساک

جٹت = جڑی ہوئی ؛ نیلمن - نیلم ؛ الی = بھنورا ؛ منو - گویا ؛
"اُسکی ناک میں نیلم جڑی ہوئی سینک (لونگ) کسقدر بھلی معلوم ہوتی ہی گویا چمپا کی کلی پر بھنورا بیٹھا ہوا اُس کا رس لے رہا ہے"
اس زبان میں بھنورے کو بہت رسوخ حاصل ہے، اور اسمیں کلام نہیں کہ بعض جگہ اِس کی سادہ تشبیہ بہت پر لطف معلوم ہوتی ہے۔ اِس وجہ سے یہ اعتراض نہیں ہو سکتا کہ بھنورا بڑا ہوتا ہے ؛ اور اُسی لحاظ سے سینک (لونگ) کی جسامت خیال کیجائے، تو ناک اور تشبیہ دونوں کا حسن جاتا رہتا ہی، کیونکہ بھنورا جیسا گودنے سے نشان کا مشبہ بہ بننے کیلئے بڑا ہوتا ہے، ویسا ہی ناک کی کیل ہونے کے لیئے بہت چھوٹا بھی دیکھا گیا ہے۔

بَرَنُ، بَاسُ، سُکُمارتا سَب بادھ رہی سَمائے
پَنکھُری لگی گلاب کی گال نہ جانی جائے

یہ دوہا نہایت پاکیزہ ہے اور بہت پُرلطف ہے، اس میں رخسار کی تعریف ہے اور اس میں شک نہیں کہ بڑی جامع مانع ہے۔ کہتا ہے کہ:-

"اُس کے عارض (رنگیں) پر گلاب کے پھول کی پنکھڑی نظر ہی نہیں آتی، کیونکہ اُس (پنکھڑی) کی رنگت، نزاکت، خوشبو، اُسکے رخسار میں ایسی سما کے رہگئی ہے کہ مطلق تمیز نہیں ہوسکتی" گلاب کی پنکھڑی اگر محض اپنے رنگ کی وجہ سے نہ دکھلائی دیتی، تو کوئی بات نہ تھی، لیکن شاعر کا یہ تخیل، کہ اسکی خوشبو اور نزاکت بھی رخسارِ محبوب پر نمایاں نہیں، عجیب انداز بیان ہے، رخسار کی صرف رنگینی ہی قابل تعریف نہیں، بلکہ اسکی نزاکت اور نکہت بھی تو کوئی چیز ہے اور اس امر کے ظاہر کرنیکے لیئے یہ پیرایہ کہ "پنکھڑی کی نزاکت، خوشبو، اور رنگینی سب کی سب اسکے عارض پر بہار میں سما کے رہ گئی ہیں" کس درجہ پرکیف ہے، سماجانے کا تخیل نہایت پاکیزہ ہے۔

اَرُن، بَرَن، تَرُنی چَرَن اَنگُری اَت سُکمار
چُوَت سُرَنگ رنگ سُو منُو چَپ بچھِیَن کے بھار

"اس نازنین کے (رنگین) پیر کی انگلیاں اسقدر نازک ہیں، کہ چھلوں کے دبنے سے رنگ شہاب ہر انگلی سے ٹپکتا ہوا نظر آتا ہے" پیر کی انگلیوں میں عام طور سے تنگ چھلے پہنے جاتے ہیں، اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ چھلے کے کناروں پر جو حصہ گوشت کا ہوتا ہے، وہاں کی کھال بہت سُرخ نظر

آتی ہے ، اور اس لحاظ سے شاعر کا یہ تخیل نہ صرف اظہار واقعہ ہے ، بلکہ وسعت معلومات پر دلالت کرتا ہے .

یا اَنُراگی چِت کی گَتْ سمجھے نہیں کوئے

جیُوں جیُوں ڈُوبے شیام رنگ تیُوں تیُوں اُجّل ہوئے

اُس محبت سرشت قلب کی بھی عجیب حالت ہی ، اسکے رموز کون سمجھہ سکتا ہی (دیکھو نا ، جتنا شیام (سانولے) رنگ میں ڈوبتا جاتا ہے ، اُتنا ہی مصفّٰی اور منور ہوتا جاتا ہے ،، دوہا بہت لطیف ہی . اِسمیں اِک حُسن ملیح کے اثرات کا حال بیان کیا گیا ہے ، کہ گو دیکھنے میں سانولا ہے لیکن فی المعنے اس درجہ شفاف ہی کہ اُسپر مٹنے والا دل اُسکے تعلق سے اُجلا ہو جاتا ہے انداز بیان دلکش ہے .

نہیں پراگ ، نہیں مدھکر ، نہیں بکاس اِہ کال

الی کلی ہی سوں بندھیو ، آگے کون حوال

ایک سہیلی دوسری سہیلی سے ، کم عمر عروس سے ، شوہر کی شدتِ محبت و شغف کا حال بیان کر رہی ہے کہ " نہ شگفتگی ہے ، نہ شیرینی ، اور نہ ابھی تک زیرہ کہیں نمودار ہوا ہے ، (میں کہتی ہوں کہ اس حالت میں بھنورا کلی سے

لپٹا ہوا ہے۔ (خدا جانے) آگے چل کے (جب یہ غنچہ ناشگفتہ متبسم ہونے پر آئے گا) اُسکا، (اُسکی بدمستیوں کا) کیا حال ہوگا !"

سہیلیوں کو کیا خبر، کہ وہ اس غنچگی کی حالت میں، خدا معلوم، کسقدر دل آویزیاں کتنی فریفتگیاں، اپنی بے خبری میں چھپائے ہوئے ہے۔ ہائے، اُس کی بستگی سے اِس درجہ دلبستگی، کچھ اُسی عاشق سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کیوں ہے، مگر شاعر کا یہ تخیل کہ "آگے چلکے کیا حال ہوگا" انتہائے محبت کی وہ پیشینگوئی ہے، جسکا تصور ہی معلوم نہیں کس عالم میں پہنچا دیتا ہے۔

تُوں رُہ سکھی ہوں ہی لکھوں نہ اٹا بَل بال

سب ہی بِن سَسِ ہی اُوے دیہیں اَرگ اکال

گنیش چوتھ کو ہنود روزہ رکھتے ہیں، اور جس وقت چاند نکلتا ہے، اُس وقت کچھ مراسم مذہبی (چاند کو دیکھکر) ادا کرتے ہیں اور روزہ افطار کرتے ہیں، اور اسی کو "اَرگ" کہتے ہیں۔ اس دوہے میں ایک سہیلی نے ایک نازنین ہمہ جمال سے مخاطب ہوکر، نہایت دلکش انداز میں اُسکے حسن کی طرف اعراض کرتی ہے کہ :-

"(آپ مہربانی کرکے) کوٹھے پر چڑھ کے چاند نہ دیکھیں، کیا فائدہ کہ بغیر چاند نکلے سب لوگ اَرگ دینے لگیں (اور روزہ افطار کردیں)" نہایت دلچسپ

کنایہ کی صورت میں، اُسکے حُسن درخشندہ کی تعریف کررہی ہے، جب وقت، وہ کوٹھے پر جلوہ افروز ہوگی (گو وہ خود چاند ہی دیکھنے کو جاتی ہے) مگر اور لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ چاند نکل آیا، اور روزہ شکنی پر آمادہ ہو جاینگے، اللہ رے حُسن ایمان شکن!

کنچن تن، گھن برن بر، رہیو رنگ مل رنگ
جانی جات سُوباس ہی کیسر لائی انگ

"(اُس کے) سنہرے اور رنگین جسم میں، زعفران کا رنگ (جو اُس کے بدن میں مَلی ہوئی ہے) کچھ ایسا مل کے رہ گیا ہے، کہ اگر زعفران کی خوشبو مابہ الامتیاز نہو، تو کسی طرح پتہ نہیں چل سکتا، کہ اُسکے جسم پر کیسر ملی گئی ہے یا نہیں" اس دوہے میں بھی رنگ بدن کی تعریف ہے۔ اور نہایت دلکش پیرایہ میں ہے۔ شعرائے فارسی و اُردو، بدن کا زعفرانی ہونا قابل ستائش نہیں سمجھتے مگر بھاشا میں روا ہے۔

کوٹ جتن کرے تو وہ ناگر نیہہ دُو رَتن
کہے دیت چت چیکنو نئی رکھائی نین

ناگر۔ نہایت پیار کا لفظ ہے، جس سے مخاطبہ کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ:-

"اے ناگر، اے پیارے، تم کتنا ہی چھپاؤ، کتنا ہی بنو، لیکن کہیں محبت بھی چھپ سکتی ہے، یہ تمہاری آنکھوں کی رکھائی خود افسانۂ الفت کی تشہیر ہے"، کیا بات لکھی ہے! جو رموز محبت سے آشنا ہے، وہ اسکا لطف اُٹھا سکتا ہے، مرزا نوشہ غالب کہتے ہیں ؎

عاشقی کا پردہ ہے بیگانگی
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

تجاہل عارفانہ سے راز محبت کے چھپانے میں کامیاب ہونا تو محال ہے، مگر اشتعال الفت کے لیئے البتہ بے مثل ادا ہے ؎

خوش ہوں اس سے کہ ساری بزم میں وہ
مجھ سے آنکھیں چرائے بیٹھے ہیں
(نیاز)

کون سُنے کا سے کہوں سُرت بِساری ناہ

بدا بدری جی لیت ہیں یہ بدرا بدراہ

اس دوہے میں ایک مہجور نازنین موسم برشکال کی تکالیف کا اظہار کر رہی ہے کہ "(میری داستانِ فراق کا یونہی) کوئی سُننے والا نہیں جس سے اظہارِ غم کروں (اور یونہی) اُسکی صورت کا خیال کسی وقت سامنے سے نہیں ہٹتا (اور اسپر اور قیامت) اِن بدراہ بادلوں کی عداوت ہے جو بد بد کے، شرط مار مار کے اور بھی

میرا جی لئے لیتے ہیں" اس دوہے میں "بدا بدی جی لیت ہیں" خاص فقرہ ہے
نہ صرف جسکا اندازِ بیان بیساختہ اور پیارا ہے بلکہ یہ فورِ کرب، شدت بے چینی
کا بھی اک پاکیزہ مرقع وردہ ہے اجو اُسکے جذباتِ مضطر کے لحاظ سے اک دنیائے
آلام و تاثر ہے۔ بدرا، بدراہ میں تجنیس صورت و خط ہے۔

بَام بَانھ پھَرکَتْ ملے جُو پِی جِیُوَن مُور
تَو تُوں ہی سُوبھینٹ ہوَ راکھ وَاہنے دُور

بام - بایاں؛ بانھ - بازو، کہتی ہے کہ "آج میرا بایاں بازو پھڑک رہا ہے اگر
میرا معشوق ملگیا، تو (اے اس خبر فرحت اثر کے حامل بازو) سب سے پہلے تجھی کو
فخر مواصلت بخشوں گی، داہنے بازو کو دور رکھونگی"، اس میں قابل داد اسکا انتہائے
تخیل ہے، جس سے وہ لذت کش بنی ہوئی ہے۔ تنہائی میں، وفورِ شوق و ذوق
میں بازو کے پھڑکنے سے تاویلِ وصل تلاش کرنا، اور پھر اُسی کے ساتھ عالمِ تصور
میں اس مژدہ رساں بازو کی طرف اس اندازِ محبت سے مخاطبہ کرنا اور اس اعتراف
منت میں اپنی محبوب ترین شئے کو اُسکے سامنے پیشکش کرنا، یہ وہ جذبات ہیں
جن کا ایسے بے ساختہ پن سے دوہے میں ضبط کر لینا شاعر کی قادر الکلامی
پر دال ہے ؛

کت بے کلج چلائی اَت چترائی کی چال
کہے دیت گن راورے سب گن بن گن مال

گُن = حرکت، ڈورا، چترائی = ہوشیاری، چالاکی، کت = کیوں.
شوہر شب بھر غائب رہنے کے بعد صبح کو گھر آیا ہے، اور پوچھے جانے پر حیلہ بازیاں کر رہا ہے، اسپر اُسکی نازنین بیوی کہتی ہے کہ "کیوں مجھسے بیکار چالیں چلتے ہو (میں ایسی نادان نہیں، لو تو) تمہارے سینہ کے اوپر بغیر رشتہ کے موتیوں کا مالا ہی تمہاری حرکات کا حال بتا رہا ہے" اس سے مراد یہ کہ جس پہلو میں تم نے رات بسر کی ہو اور جسکے سینے سے تمہارا سینہ ملا رہا ہے۔ اُسکے گلے کے ہار کا نشان تمہارے سینہ پر نمایاں ہے۔ تم لاکھ چالاکیاں کرو، مگر یہ تمہارے سینے پر پڑا ہوا موتیوں کا ہار کیا ہوگا۔ اسمیں بلا رشتہ کا ہار پیاری جدت ہی.

غالبًا حق تلفی ہوگی اگر اسی سلسلہ میں **ملک محمد جایسی** کی مشہور تصنیف پدماوت کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ یہ تصنیف اس درجہ منظر استحسان سے دیکھی گئی ہے کہ اکثر مشائخ متصوفین اس سے نکات تصوف حاصل کرتے ہیں، مگر ہمارا مقصد اِس تصنیف کو اِس لحاظ سے دیکھنا نہیں ہے، بلکہ باعتبار شاعری اُسکی اہمیت پر غور کرنا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ ایک مقتبس کے لیئے کافی سرمایۂ التقاط اِس سے حاصل ہو سکتا ہے

مگر ہم اس رسالہ میں صرف اُس مقام کے چند دو ہے درج کرینگے، جو **پدماوت** کے سراپا سے متعلق ہیں۔

جب راجہ **رتن سین** نے نہایت اصرار کے ساتھ **توتے** سے رانی **پدماوت** کے حُسن کا حال دریافت کیا، تو اُسکے اک اک عضو کا حال بیان کرتے ہوئے توتے نے بالونکی تعریف سے یوں شروع کیا کہ:۔

بلنین چھور جھار جو بارا سرگ پتار ہوئے اندھیارا

"اگر وہ چوٹی کھولکر بالوں کو منتشر کردے تو آسمان سے لیکر زمین تک (تمام دنیا میں) اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے"، زلفوں کی دو مخصوص صفات ہیں، سیاہی و درازی اور وہ دونوں بدرجۂ اتم اُسمیں موجود ہیں کہ" اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے"۔ اور "تمام دنیا میں"!! چوٹی کو کھولکر بالوں کو جھٹک دینا، اور پھر اس ادا سے متاثر ہونے کی حالت کو اس طور سے ظاہر کرنا کہ "تمام عالم میں تاریکی ہی تاریکی پھیل جائے"۔ بہت وسعت تخیل چاہتا ہے۔ اِس میں کلام نہیں کہ زلفوں کے اس بیانِ تاریکی سے مصنف کی نکتہ رس طبیعت پر بہت روشنی پڑتی ہے۔ پھر کہتا ہے کہ:۔

کُوَل کُٹھل کیس نگ کارے لہرن بھر سھونگ پسارے

"اُسکے موئہائے مرغولہ کی کیا صفت بیان کروں، آہ وہ اُس کے نرم نرم حلقہ ہائے

زلف! (یہ معلوم ہوتا ہے کہ، لہر بہرے سانپ ہیں جو پھن نکالے ہوئے ہیں") تشبیہ تو جیسی دلکش، نادر، اور پیاری ہے وہ ظاہر ہے، لیکن زلفوں کے سانپ کو لہر بہرا کہنا کس درجہ معنی خیز اور نازک بات ہے۔

بِدھی جانْ مَلیگرَ باسَاں سیِس چَڑھے ڈُولت چھویا سَال

اسمیں حلقہ ہائے زلف کے ہلنے کا انداز کسقدر پر کیف صورت میں ظاہر کیا گیا ہی کہ "یہ سانپ صندلی پیشانی کی خوشبو سے اِسقدر مست ہو گئے ہیں کہ سر پر چڑھے ہوئے اِدہر اُدہر جھوم رہے ہیں"، پیشانی پر پڑے ہوئے حلقہ ہائے زلف کا ہوا سے اِدہر اُدہر ہلنا، اور پھر اُسکی یہ توجیہ کرنا کہ بوئے صندل سے مست ہو ہو کر ہل رہے ہیں کسقدر لطیف بات ہی۔

کنچن ریکھ کسوٹی کسی جن گھن ماں دامِن پرکسی

اِس دوہے میں مانگ کا حال بیان کیا ہے کہ:۔

"کسوٹی پر خط طلا کھنچا ہوا ہے، یا شبِ تار میں بجلی چمک رہی ہے"، اِن دونوں استعاروں میں جو بات زیادہ تر قابل داد ہے وہ یہ ہے کہ اسی کے ضمن میں اُسکی جلد کی بھی تعریف کردیگئی، کہ وہ کندنی رنگ کی ہے۔

سرج کرن جن گنگن لیکھی　　جمنا مانجھ سرستی دیکھی

پھر مانگ کی تعریف میں کہتا ہے کہ "گویا سورج کی شعاعیں نکل کر تاریکی شب کو دور کر رہی ہیں (یا یوں سمجھئے کہ) جمنا کے اندر سُرستی ندی بہ رہی ہے" جمنا کا رنگ سیاہی مائل اور سُرستی کا شفاف خیال کیا جاتا ہے۔

تن پر پور دھرے جو موتی　　جمنا مانجھ گانگ کی سوتی

اور جب وہ (مانگ میں) موتی کوٹ کر بھر لیتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جمنا کے اندر گنگا کا سوتا پھوٹ نکلا ہے" کسقدر کامل تشبیہ ہے، غور کرنے سے معلوم ہو جائیگا کہ جس طرح پانی کی سوت میں آبی لکیریں اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ اِسی طرح مانگ میں بھی اِدھر اُدھر بالوں کے درمیان سپید خطوطِ جلی نمایاں ہوتے ہیں۔

اوٹھن ترنگ لینہہ نہ باگا　　چاہنہ اولتھ گنگن کنہہ لاگا

آنکھوں کا حال بیان کرتا ہے کہ "جس وقت وہ اُٹھتی ہیں تو ایسا جانئے ہیں جیسے بے لگام کا گھوڑا جائے، اور اگر وہ جوش ماریں تو آسمان سے جا کر لگ جائیں" دونوں باتیں دل آویز ہیں، شوخ اور شریر کے لیئے بے باگ کا گھوڑا کہنا اور اُن کے جوش کو اِس انداز سے بیان کرنا کہ آسمان سے جا کر مل جائیں، کیسا

خوب صورت طریقہ اظہار جذبات وواقعات کا ہے، سبحان اللہ۔ اِس سے زیادہ پرلطف دوہا آنکھوں کی تعریف میں یہ ہے:۔

جگ ڈولے، ڈولت نیناہاں اُولٹ اُو، ار چاہ پل ماں نہاں

" اُن کی جنبش سے سارا زمانہ جنبش میں آجاتا ہے، اور اگر وہ چاہیں تو پہاڑ کو ایک پل میں اُلٹ کے رکھدیں " جنبش چشم سے تمام دنیا کا جنبش کر جانا، کسقدر پیاری بات ہی، اور پھر یہ فقرہ کہ اگر چاہیں تو ایک پل میں پہاڑ کو اُلٹ دیں۔ وہ اندازِ بیان ہے۔ جس سے بہتر طریقہ میں اثراتِ شوخ نگاہی نہیں ظاہر کیے جاسکتے۔ مصرعۂ اولیٰ میں جو ترنم اور کیف ہی، وہ اُسی زبان میں اگر پڑھا جائے تو اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے، اک گردش نگاہ سے سارے عالم کا مرتعش ہوجانا، کچھہ عجیب پُرلطف بات ہی جسکا احاطہ الفاظ سے ممکن نہیں۔ وجدانِ صحیح جو لذتِ خاموش اِس سے حاصل کرتی ہے۔ اُس کا اظہار کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔

اُون بانَن اَسکو کُونہ مارا بیدھو رہا سگرے سنسارا

اِس دوہے میں پلکوں کی یا نگار کی تعریف کرتا ہے کہ " اُن تیروں کا زخمی (اِن ناوک کا مجروح) کوئن نہیں ہے (ارے) سارا زمانہ اُن سے بدھ رہا ہے

بجائے اسکے کہ اُنھوں سنے کو بیدھ رکھا ہے" یوں کہنا کہ "اک زبانہ آن بیدھ رہا ہے" خاص اندازِ فصاحت ہے۔ گو یہ مضمون نیا نہیں، مگر انداز آج تو ہے جو دلکشی اور دلربائی پیدا کر دیتا ہے، مژگان کے لیئے یہ بیاختہ تخیل کہ "بیدھ رہا سگرا سنسارا"! مذاقِ سلیم کے لیئے خدا معلوم کس درجہ کیف انگیز ہے، اور پھر "سگرا سنسارا" سبحان اللہ۔

ناسک دیکھ لجانیوں سُودا سُوک آئے بیسر ہوا اُودا

ناسک۔ ناک؛ سُودا = توتا؛ سوک = ستارۂ زہرہ؛ بیسر = نتھ کا آویزہ۔ اسمیں وہ اُسکی مینی کا حال بیان کرتا ہے کہ "اُسکی ناک کو دیکھکر توتا بھی شرما گیا ہے، اور اُسکی نتھ کا لٹکن بس یہ معلوم ہوتا ہے گویا زہرہ نے طلوع کیا" گو ناک کے لیئے توتے کی منقار کی تشبیہ اور زبانوں میں بھی لکھی گئی ہے، خاصکر یونانیوں میں، مگر بیسر کے لیئے زہرہ کی تلاش اور پھر اُسکا طلوع بدرجۂ کمال شاعر کی نزاکت طبیعت پر دال ہے۔

پھپ سُگندھ کرن سب آسا مگ ہر کائے لیئے ہم آسا

تُمام خوشبودار پھول یہ آسرا لگائے ہوئے ہیں کہ شاید ہمکو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت دیدے۔" اِس سے زیادہ حُسن بینی اور کیا ہو سکتا ہے کہ پھول تک

اُس کے پاس پہنچنے کی آرزو رکھیں۔

اَدِھر وِسن پر ناسک سُوبھا وار یوں دیکھہ سوامن لُوبھا

"اُسکے دانتوں کے اوپر اُسکے (خم) بینی کی پھبن، گویا (دانہ ہائے) انار کو دیکھکر توتے کا دل للچایا ہے (اور وہ اپنی منقار جُھکائے ہوئے ہے)" شاعر کی تلاش کی داد دینا چاہیئے۔

بھئی مجیٹھ با تن رنگ لاگیں کُسُم رنگ ٹھیرے نہ آگیں

لبوں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ" ہنگامِ گفتگو اُسکے لبوں سے مجیٹھ کا سا سُرخ رنگ ٹپکتا ہے، اور کُسُم کا رنگ تو اُسکے آگے کوئی چیز نہیں ہے" بارِ سخن سے وقت تکلم لبوں سے رنگ ٹپکنا، اِس سے زیادہ لطیف و نازک بات اور کیا ہو سکتی ہے، اِسمیں نہ صرف لبوں کی سُرخی دکھائی گئی ہے بلکہ اُنکی نرمی و نزاکت کو بھی تخیل کی انتہائی حد تک پہنچا دیا ہے کہ بات کرنے میں لب کا لب سے ملنا ہی رنگ چکانے کے لیے کافی ہے۔

پُن برنوں کل سُرنگ کپولا اِک نارنگ کے دُوؤ اَمولا

اِس میں رخسار کا حال بیان کیا گیا ہے کہ" اُسکے رخسار ہائے رنگین کا کیا ذکر ہو سکے

(یہ سمجھ لو کہ) ایک نارنگی کے دو ٹکڑے کر دیئے گئے ہیں"۔ تشبیہ نہایت کامل ہے، اور چونکہ حرف تشبیہ کو ترک کر کے استعارہ کی صورت اختیار کر لی گئی ہے اسلئے اور بھی پُر لطف ہو گیا ہے۔ یوں نہیں کہا کہ "اُسکے رخسار ایسے ہیں جیسے نارنگی کے دو ٹکڑے" بلکہ اس طرح بیان کیا کہ "یہ تو نارنگی کے دو ٹکڑے ہیں" جو لطف اس اندازِ اظہار سے نمایاں ہے وہ بیان سے مستغنی ہے۔ علاوہ اِسکے ایک ہی نارنگی کے دو ٹکڑے کہنا۔ اس طرز بیان کو اور بھی بلیغ بنا رہا ہے۔

کھن کھن جو وہ پیہ سر کھا کانپت بیچ وھول دس ہا

"گھڑی گھڑی وہ جو سر پر دوپٹہ ڈالتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا بجلی چمک جاتی ہے"

بجلی چمک جانے کا تخیل شاعر کو گھڑی گھڑی دوپٹہ اوڑھنے کے انداز سے پیدا ہوا اور اسمیں کلام نہیں کہ اس ادا کو اس سے بہتر الفاظ میں بیان کرنا محال ہے اِس میں مشبّہ بہ بجلی ہے اور بادی النظر میں دوپٹہ مشبّہ ہوتا ہی، لیکن فی الحقیقت یہ بات نہیں ہے، بلکہ مجموعی حیثیت اُس ادا کی (یعنی دوپٹہ کا بار بار ڈھل جانا اور پھر اُسکا گھڑی گھڑی اُوڑھا جانا، اعضا میں حرکت پیدا ہونا، چہرہ یا دیگر اعضائے جسم کا نمایاں ہو ہو جانا) مشبّہ واقع ہے۔ بجلی چمک جانے کا مفہوم یوں نہیں ہے کہ اُسکی یہ ادا بجلی کا سا اثر رکھتی ہے، بہ حیثیت مجموعی اِس کا

سارا انداز برق پاش ہی، اِس حالت میں کسی حسین نازنین کو دیکھکر فوراً اِس تخیل کی طرف ذہن کا منتقل ہوجانا ایک اعلیٰ درجہ کی نکتہ رس اور شاعرانہ طبیعت کا کام ہے۔

جن ہئے کاڑھ پریو اٹھاڑا ته تیں اَدِھک بھاو گیں باڑھا

گردن کی تعریف لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ "جیسے سینہ اُبھارے ہوئے اور گردن نکالے ہوئے کبوتر کھڑا ہے، بلکہ اُسکا اندازِ گردن اِس سے بھی بڑھا ہوا ہے" گردن کو، کبوتر کی اِس ادا سے تعبیر کرنا کہ وہ سینہ نکالے ہوئے اور گردن اُٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ بہت خوب ہے، اور خاصکر سینہ نکالنے کا انداز جسکا لطف اُسوقت حاصل ہوسکتا ہے، جب اک حسین و پرشباب عورت کی ادائے گردن فرازی پر اسکو مطابق کیجئے۔ لیکن اِس وجہ سے کے اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ باوصف اِس نادر تشبیہ کے بھی شاعر اپنے پندار میں اِس تخیل کو اُسکے حُسن گردن کے لحاظ سے موزوں و مناسب نہیں سمجھتا، اور اِسی لئے اِسکے بعد ہی فوراً یہ کہہ دینا کہ اُسکا انداز اِس سے بھی بڑھکر ہے، شعر میں بہت حُسن پیدا کر رہا ہے۔

جان رُکت ہتیرین بوڑیں رب پر بہات دی جوڑیں

ہتیلیوں کی تعریف کرتا ہے کہ "اُسکے کفِ دست یہ معلوم ہوتا ہی کہ خون

میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ آفتاب وقت طلوع کے گرم ہوتا ہی اور وہ سرد ہیں"۔
اسمیں رنگِ کفِ دست کو دو تشبیہوں کی صورت میں بیان کیا ہے، ایک میں تو
اُن کے رنگ کو سرخیٔ خون سے تعبیر کیا۔ اور دوسری میں آفتاب سے تشبیہ دی جبکہ
وہ صبحکو نکل رہا ہو، گو دونوں بیان ایسے قابل ستایش نہیں، لیکن طرز اظہار نہایت
ہی دلکش ہے۔ ایک ہی شعر یا جملہ میں جب مشبّہ بہ دو قرار دیئے جاتے ہیں
اور کلام کے جزو اول میں اُن میں سے ایک کے ساتھ تشبیہ دینے کے بعد دوسرے
کو استعارہ یا کنایہ کی شکل میں ظاہر کر دیتے ہیں، تو وہ کلام نہایت فصیح ہو جاتا
ہے۔ اور یہی خوبی اس شعر میں ہے کہ پہلے مصرعہ میں تو رنگِ کفِ دست کو خون
سے تشبیہ دی۔ اور دوسرے مصرعہ میں اُس سے بالکل قطع تعلق کرکے ایک جدا
بات کہدی کہ "آفتاب تو وقتِ طلوع کے گرم ہوتا ہے اور وہ ہتیلی سرد ہی"
مفہوم وہی ہوا کہ اُسکی ہتیلیاں مثل آفتاب کے ہیں۔ لیکن تشبیہ کو چھوڑ کے استعارہ
و کنایہ کی صورت اختیار کرلی۔ جس سے یہ شعر اپنی فصاحت کے لحاظ سے حدِّ
کمال کو پہونچگیا، علاوہ اسکے اس سے زیادہ نازک بات جس نے اس شعر کو
بلیغ بھی انتہا درجہ کا بنا دیا ہے۔ وہ مشبّہ بہ سے اعراض ہے کہ اُسکی ہتیلیاں
باعتبار رنگ کے ضرور آفتابِ صبح کے مماثل ہیں، لیکن یہ سرد ہیں اور وہ گرم،
اِس انداز سے شاعر نے یہ کمال دکھایا کہ مشبّہ بہ گو بعض خصوصیات کے لحاظ
سے مشبّہ بہ بننے کی قابلیت رکھتا ہے، مگر پھر بھی وہ بہت ناقص ہی اور اسلیے

ہم اُس سے تشبیہ نہیں دیتے، حالانکہ تشبیہ ظاہر کر دی۔

اُو، پھر ہیں نگ جری انگوٹھی جگ بن جیو اجیو وہ موٹھی

کہتا ہی کہ "وہ (انگلی میں) جڑاؤ انگوٹھی پہنی ہے۔ زمانہ بیجان ہی، جان اُسکے قبضہ میں ہو"۔ اِس دوہے میں پہلا مصرعہ مشبہ اور دوسرا مشبہ بہ معلوم ہوتا ہی لیکن یہ بات نہیں، اس شعر میں بھی شعر ماسبق کی سی لطافتِ بیان دکھائی ہی کہ پہلے مصرعہ میں اُسکی حالتِ خاص دکھادی اور فوراً ہی دوسرے مصرعہ میں بلا الفاظِ مشبہ لائے ہوے، اُس ادا کے اثرات کا حال بیان کر دیا۔ اور یہ وہ موثر اور لطیف سخن گسترانہ انداز ہی جس سے وہی شخص واقف ہو سکتا ہی جسکو اعلےٰ درجہ کا کمال فنِ شاعری حاصل ہو۔ مثلاً کوئی یوں کہے کہ "اُس نے اِس انداز سے جوڑا باندھا کہ میرا دل بھی اُسکے ساتھ بندھ گیا، لیکن اک باکمال شاعر اسطرح کبھی نہ ظاہر کریگا، بلکہ اُسکے دو ٹکڑے کر دیگا، ایک میں اُسکی ادا دکھلا دیگا۔ اور دوسرے میں اُسکا اثر۔ اور یوں ظاہر کریگا کہ "اُسنے جوڑا باندھا، دیکھتا ہوں تو دل پہلو میں نہیں ہے"۔

لہریں دیت پیٹھ پر جن چڑھا چیر اوڑھا دا کینچل مڑھا

"اُسکی پشت پر چوٹی ایسی معلوم ہوتی ہی، جیسے ناگن پڑی لہرا رہی ہو، اور اُسپر باریک دوپٹہ کینچلی نظر آتا ہے" چوٹی یا زلفوں کو سانپ یا ناگن کہنا ایک عام بات ہی، لیکن اِس تشبیہ کا حُسن محض پدماوت کے جالیدار باریک دوپٹہ سے دوبالا ہو گیا ہی جس نے کینچلی کی خدمت انجام دیکے اِس افعی کی حرکت کو سُست

کردیا، ورنہ اِسمیں کلام نہیں کہ پھر اسکا زہر بے پناہ ثابت ہوتا۔

مانو نلن کھنڈ دوئی بھئے دونن بیچ لنک تار رہگئے

کسقدر پیاری، دلکش اور نازک بات کہی ہی، کمر کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہی کہ "گلِ نیلوفر کے دو ٹکڑے ہوگئے ہیں، اور دونوں کے درمیان کمر تار سی نظر آرہی ہے (جس سے یہ دونوں ٹکڑے جڑے ہوئے ہیں)" اس تشبیہ کا لطف تام اُس وقت حاصل ہوسکتا ہی جب اسکی صورت آپ اپنی نگاہوں کے سامنے قائم کریں اور پیٹھ کے اُن دونوں حصوں پر نظر ڈالیں جو ریڑھ کے دونوں جانب ہوتے ہیں، اِسکے بعد نازک کمر کا خیال کریں، تخیل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔

کونول کنول سوگندھ سریرو سمند رلہر سوہی تن چیرو

اُسکا نرم و نازک بدن مثل گلِ نیلوفر کے ہی۔ اور اُسپر دوپٹہ ایسا نظر آتا ہی جیسے دریا کی لہر، نہایت دل آویز تشبیہ ہی، نیلوفر ہمیشہ پانی میں پایا جاتا ہی۔ اور اُسپر لہروں کا آنا بھی معمولی بات ہی، اِس لیئے اگر وہ جسم کو صرف گلِ نیلوفر کہکے رہجاتا تو تشبیہ ناقص رہجاتی، مگر نہیں شاعر نے اُسکے لیئے موجِ آب بھی ڈھونڈھ نکالی اور آبِ رواں کے دوپٹہ سے وہ کام نکال لیا۔ بدن کی تشبیہ نیلوفر سے باعتبار کیفیت کے ہے نہ بلحاظ صورت کے

اِس مقام کے علاوہ اسی کتاب میں ایک جگہ لورا گھو پنڈت کی زبانی پدماوت رانی کے حُسن کا حال بیان کیا ہی۔ جب یہ سلطان علاوٗالدین کے پاس گیا تو اُسنے پدماوت کا حال

بیان کرتے ہوئے کہتا ہی کہ:-

دیرگھ چار، چار لگھ سوئی　　سُبھر چار چھوں کھینی ہوئی

اُسکے بدن میں چار چیزیں دراز، چار کوتاہ، چار موٹی اور چار پتلی ہیں،، اِن کا حال وہ آگے چلکے یوں کہتا ہی کہ:-

پرتھم کیس دیرگھ سر موہنیں　　اور دیرگھ اونگریں کر سوہنیں

دیرگھ نین تیکھ تنھ دیکھا　　دیرگھ گیوں کنٹھ ترریکھا

"یعنی دراز چیزوں میں تو پہلے سر کے بال ہیں، دوسرے اُسکی اُنگلیاں، تیسرے آنکھیں اور چوتھے گردن اور اُسکے نیچے کے خطوط،،

پن لگھ دسن ہونھ جن ہیرا　　او لگھ کچ اوتنگ جن بھیرا

لگھ للاٹ دوتیج پر گاسو　　او نابھے لگھ چندن باسو

"چھوٹی چیزوں میں ایک تو اُسکے دانت ہیں جو الماس کیطرح ہیں، دوسرے اُسکی چھاتیاں نارنج مثال ہیں، تیسرے ہلال آسا اُسکی پیشانی اور چوتھے صندل بیز اُسکی ناف ہی"-

ناسک کھین کھرگ کی دھارا　　کھین لنک جن کیہر ہارا

کھین پیٹ جانو نہ آنتا　　کھین اَدھر بدرم رنگ راتا

"باریک چیزوں میں ایک تو اُسکی ناک ہی جو تلوار کی دہار کی طرح ہے، دوسرے اُسکی کمر، جس سے چیتا بھی ہار گیا ہی، تیسرے شکم جسمیں آنت معلوم ہی نہیں ہوتی، چوتھے لب جو مرجان کی طرح سُرخ ہیں"-

سُبھر کپول دیکھ مکھ سوبھا سُبھر تنب دیکھ من لوبھا
سُبھر کلائیں ات بنی سبھر جنگھ گج چال سورہ سنگار بنگی کرنھ دیوتا مال

"گداز چیزوں میں اول رخسار ہے، دوسرے سُرین ہیں، تیسرے کلائیاں اچھے رانیں"
پہلے جب اُس نے اِن چار چار کی تقسیم کی تھی تو بالکل چیستاں سی نظر آتی تھی لیکن اِس تقسیم کی تفصیل پڑھ لینے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اِن میں سارا حُسن اکٹھا ہو گیا ہے اور اِس سے زیادہ اجتماع ممکن نہیں۔ اِس کے آگے اُس نے ہر شئے کی جدا صفت بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ مانگ کا حال ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے کہ:۔

بھئی اور یہ پھوپ سب نلماں جن بگ بجھرے گھن ساماں

"معلوم ہوتا ہے کہ نفیس پھولوں سے (اُسکی مانگ) لدی ہوئی ہے، (یا یوں سمجھو کہ) سیاہ بادلوں میں بگلوں کی قطار اُڑی چلی جا رہی ہے" دونوں تشبیہیں پاکیزہ و لطیف ہیں۔

تلک سنوار جو چندن رچے دویج مانجھ جانو گج پچے

تلک = ہلال نما نشان جو پیشانی پر لگایا جاتا ہے؛ چندن = صندل (رچھ کا ہوا صندل)،
مطلب یہ کہ "تلک کے نشانِ ہلالی کھینچنے کے بعد اُسکا صندل لگانا پس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہ نو کے اندر عقد ثریا کا جگمگھٹ ہے"، صندل کی چھینٹوں کو تلک کے اندر عقد ثریا کہنا، بڑی پاکیزہ بندش ہے۔

سری جو رتن مانگ بیسارا جانو گگن ٹوٹ نس تارا

سری = ایک مدور زیور جو سر کے لیئے مخصوص ہے؛ "جواہر لگا ہوا سری جو مانگ کے اوپر رکھ لیا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رات کو کوئی تارا ٹوٹا ہے"، چونکہ زیورِ مانگ در بالوں سے جدا نظر آتا ہے اس لیے ستارہ ٹوٹنا اسکے لیئے تلاش کیا گیا، تشبیہ کامل نہ سہی، لیکن لطیف ضرور ہے۔

نین چتر ٹے روپ چتیرے   کنول پتر پر مدھکر پھیرے۔

ہوشیار تیز ہیں آنکھیں، اور حسین چہرہ، یہ معلوم ہوتا ہی کہ نیلوفر کی پتی پر بھونرا بیٹھا ہے" چہرہ کے حسن کو برگ نیلوفر سے تشبیہ دینا اور پتلیوں کے لحاظ سے آنکھونکو بھونرا کہنا نہایت لطیف تشبیہ ہی، اسمیں تشبیہ ثانی تو باعتبار صورت کے ہی اور وجہ شبہ بھی موجود ہی یعنی پتلیوں کی سیاہی، مگر تشبیہ اول تو باعتبار کیف کے ہی، چہرہ کو برگ نیلوفر سے تشبیہ نہیں دی، بلکہ اُسکے حسن کو برگ نیلوفر کا حسن قرار دیا ہے۔ اور تشبیہا میں یہ اندازِ بیان بہت پاکیزہ ہی۔

سیت سیام اس چمکت دیٹھی   سیام ہیر نکھ پانت بیٹھی

اِسمیں مسی مالیدہ دانتوں کی تعریف ہی کہتا ہی کہ "سپیدی اور سیاہی دونوں ایسی مخرج ہیں، جیسے نیلم اور ہیرے کی قطار ہو"

بیر د سوکھ پاؤ جس نیرو   سُنَت بُیَن تس پلھ سریرو

(اُسکا اندازِ گفتگو ایسا ہی جس سے سامع اپنے بدن کو ایسا محسوس کرنے لگتا ہی، جیسے خشک درخت سیراب ہوجائے" نہایت پاکیزہ دوہا ہے. کسی کی گفتگو کو سُن کر ایسا مسرور ہونا، جیسے پانی سے نہال خشک شاداب خرم ہوجائے۔ انتہا درجہ کی لذت سخن پر شاہد ہے، اور پھر اُس لذت کشی میں ذہن کا اس مثال کی طرف منتقل ہونا، قلب روح کی انتہائے اطمینان و مسرت ظاہر کرتا ہی، اِس انداز کا ایک شعر غالب کا بھی ہی ؎ دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا + میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے ۔

"نیاز"

اختتام حصۂ اول

یہ واقعہ ہے

کہ اب گاڑیوں کے لئے ولایت آرڈر دینے کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی کیونکہ بالکل ولایتی ڈیزائن پر ہر قسم کی گاڑیاں نہایت ارزاں اور جلدی حسب عمدہ ہندوستان بنانے لگا ہے۔ ہیں نے بارہا۔ جاننے والے لوگوں سے امتحاناً کریم اینڈ کو کی بنائی ہوئی ہر قسم کی گاڑیوں کو چلتی ہوئی دکھلا کر پوچھا کہ یہ کہاں کی بنی ہوئی معلوم ہوتی ہیں تو اُنہوں نے پورے یقین کے ساتھ یہی جواب دیا کہ جناب اسکی ساخت ہی دور سے بتلا رہی ہے کہ یہ ولایتی بنی ہوئی ہوں۔ جب ان کو یہ بتلایا گیا کہ نہیں کریم اینڈ کو کی **صناعی** ہے تو حیران رہ گئے۔ پھر کارخانہ میں تشریف لے جاکر۔ رنگ روغن پالش۔ لکڑی۔ لوہا۔ سلور پیتل۔ چاندی کے پرزے۔ ربڑ۔ پوشش کا بہترین اسٹاک۔ اور کاریگروں کو ہاتھ اور مشینوں سے کام کرتا ہوا دیکھکر قائل ہو گئے اور ساتھ ہی گاڑی کے لیئے آرڈر بھی دے گئے۔ جو بہت جلد حسب فرمائش تعمیل کردیا گیا۔ آپ بھی ایسا کرسکتے ہیں۔ ہم نے آپ کو ولایت کی زیر باریوں سے بچا لیا کیا اب بھی آپ اور آپ کے معزز احباب اس فرم کو بھول جائینگے جسکا نام

کریم اینڈ کو۔ بلی ماران دہلی

ہے

ہماری لسٹر لسٹ۔ اور فہرست عمدہ مفت طلب فرمائیے۔ علوی